راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

نومبر 2017ء

Book Review

Title: **Jahan Gard** (Globe Trotter)

Author: **Amir Bin Ali**

Publishers: Nastalique, Lahore

Pages: 240 Price: Rs. 300/-

By: **Dr. Amjad Parvez**

It was a unearthing for me when Amir Bin Ali mentioned that the national flower of Japan, Cherry has its origins from Himalayan mountains near Islamabad in Pakistan With the passage of time its growth spread in other parts of India, America, Canada, Korea and Japan. In Japan it is called 'Sakora' in local language. Flowers on the trees appear only during spring season and the tradition of watching these flowers is called 'Hanami'. This information is available in the first section (on Japan) of the book 'Jahan Gard' by Amir Bin Ali. The reason offered by the author for writing this 'travelogue' is to share his experiences with the readers of whom he met, what he witnessed and where he went in his life-time. He claims that he has compiled these articles published in his columns in the dailies Jang, Khabrain and his literary journal Arxang. He also says that he has written these columnsin such a manner that these can be read by all members of the familydevoid of any touch of vulgarity. This reviewer's first impression of the book is its excellent, printing, quality paper used and dedication of the book to the soil of Pakistan where drops of rain emit such odour that is not found elsewhere in the world. There are nineteen articles written on various aspects of

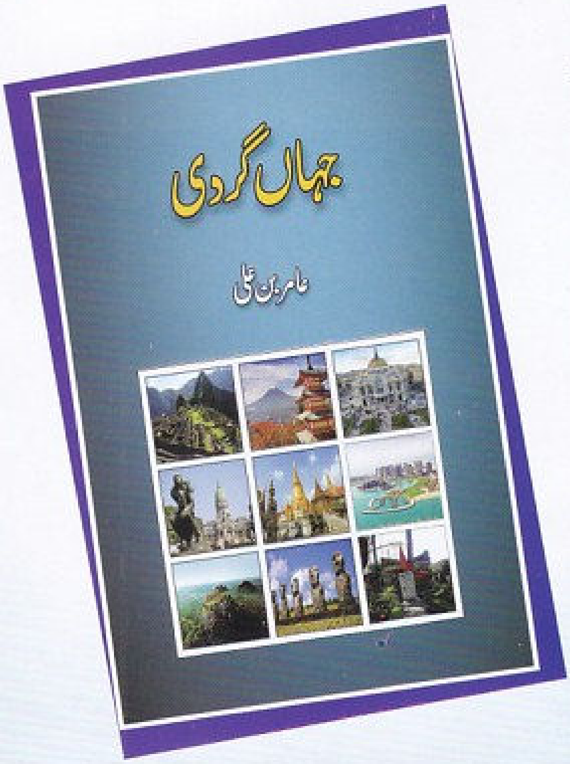

Japan where Amir Bin Ali resides. He originally hails from Mian Chunnoo. This reviewer found the essay on Hiroshima's atomic tomb intriguing (Page 50). Despite witnessing the hurricane Harvey personally in Texas in August 2017 that devastated Houston, Sugarland and suburbs, this reviewer agrees with the author that the atomic bombs that devastated Hiroshima and Nagasaki was a disaster unparalleled in the history. A tomb survived called A-tomb where 'A' stands for the word Atomic. A part of the tomb weighing 300 kg found in the sea shall be used for further research. It is not yet decided whether this tomb shall be rebuilt or shall remain as such as heritage as declared by the United Nations.

Another surprise for the readers would be the Urdu language sign boards in Japan (Page 77). The history of Urdu dates back to 1796 when work on Urdu dictionary was initiated. Today Japan has Urdu Chairs in Tokyo, Osaka and Sai Tama Universities. All this brings us to witness the importance and diversity of Urdu language. The art of small sized (few inches) flowers is the specialty of Japan. They are high priced flowers and their export is banned. Decoration of flowers is another art possessed by Japanese called 'Oshibana'.

(Continued Inner Pages)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 18 نومبر 2017ء شمارہ نمبر 10

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{ مجلس ادارت }

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
◉ لبنیٰ صفدر

{ مجلس مشاورت }

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)
محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ڈاکٹر سید ندیم حسین (ناروے) ◉ ناز اوکاڑوی

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ● نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 ناز اوکاڑوی 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

گوشہ حمد / ڈاکٹر اخلاق گیلانی ۲

گوشہ نعت / تفاخر محمود گوندل ، ۳

نعت / ، ۴

مضامین:

○ اقبال کا ایک خواب وحدتِ ملت / ڈاکٹر مختار عزمی ، ۵

○ عامر بن علی کی جہاں گردی / لبنیٰ صفدر ، ۷

○ اُردو نثری نظم، شاعری یا غیر شاعری / ساحل سلہری ، ۹

○ جدید غزل کی توانا آواز......دلاور علی آزر / قیصر مسعود ، ۱۱

○ علی اعجاز......ایک عہد / ڈاکٹر ایم ابرار ، ۱۳

افسانے

○ مائی چانن / انیلہ بھلر ، ۱۴

○ سیٹ بیلٹ / ایوب صابر ، ۱۸

○ آتش عشق / محمد حسنین صابر ، ۲۲

○ فاحشہ / فیاض ملک ، ۲۶

شعری گوشے:

○ لطیف ساحل، ارشد نذیر ساحل، سعدیہ سیٹھی، ظفر اعوان،
عدیل احمد آسی، طاہر عدیل طاہر ، ۲۸-۳۳

سفر نامے

○ نئی دنیا کی چاہ میں / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ، ۳۴

○ ناران، کاغان اور مری کا سفر / ایم آر شاہد ، ۴۰

○ سبز گلاب / عامر بن علی ، ۴۴

○ شاعری ، ۴۶

○ بقیہ انٹرویو ظہور الاسلام جاوید ، ۴۷

مختصر ادبی خبریں ، ۴۸

تبصرۂ کتب ، ۴۹

نامہ ہائے احباب ، ۵۱

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد/ڈاکٹر اخلاق گیلانی

مجھ کو تیری روشنی درکار ہے
اور تھوڑی زندگی درکار ہے
تیری ہی تعریف سے مہکا کرے
اب تو ایسی شاعری درکار ہے
اس لیے قرآن پڑھتا ہوں میں روز
معرفت کی روشنی درکار ہے
اپنی منزل کا نشاں پا لوں گا میں
مجھ کو تیری دوستی درکار ہے
اس لیے ہی ذکر کرتا ہوں ترا
روح کو اِک تازگی درکار ہے
اپنے اندر تجھ کو آخر پاؤں میں
گونہ گوں اِک خامشی درکار ہے
رب سے کوئی چیز پانے کے لیے
ہر طلب میں مخلصی درکار ہے
عشق والے جھوم کر پڑھتے رہیں
ایک ایسی مثنوی درکار ہے
شاہ سے راضی رہے خالق سدا
اُس کو ایسی رہبری درکار ہے

آ مل، کر دے نورم نور
ربا کیوں ہے دُورم دُور
میں تو سمجھوں تجھ کو سب
میں کیا جانوں حُورم حُور
خود کو مجھ پر ظاہر کر
دید کو میں ہوں چورم چور
جب بھی حشر بپا ہوگا
دونوں ہوں گے گھورم گھور
رحمت کی بارش برسا
کر پیڑوں کو بھورم بھور
دن وہ ہوگا حیرت ناک
ہر سُو ہوگا صُورم صُور
اپنا جلوہ دکھلا دے
مجھ کو کر دے طُورم طُور
تیرے کھوج میں تیرا شاہ
ہر سُو بھاگے نُورم نُور

مرا تو ہے ایماں وہی ایک
کرے زیست آساں وہی ایک
پکارے کوئی جس کو اللہ
ہے رام اور یزداں وہی ایک
اُسی سے لگائے رہو لَو
ہر اک دل میں چھپاں وہی ایک
مہک اور گلشن کی خوشبو
یہ پھول اور کلیاں وہی ایک
اُسے مانو جنت ملے گی
قیامت کا ساماں وہی ایک
وہی کام مشکل میں آئے
ہے ہر غم کا درماں وہی ایک
کھلا مثنوی سے یہ عقدہ
ہے رومی میں رقصاں وہی ایک
کوئی صبح ہو یا کوئی شام
مرے دل کا مہماں وہی ایک

جو حرم جائیں تو تقدیر بدل جاتی ہے
ساری ہستی ہی کی تعمیر بدل جاتی ہے
معتبر ہوتا ہے انساں یہاں حاجی بن کر
جانے والے کی یوں توقیر بدل جاتی ہے
بیت اللہ کی بس ایک جھلک دیکھتے ہی
سارے خوابوں ہی کی تعبیر بدل جاتی ہے
حمد کہتے ہوئے آتا ہے نظر رب کریم
لکھتے لکھتے مری تحریر بدل جاتی ہے
جب بھی قرآن سمجھنے لگے کوئی انساں
سارے جیون ہی کی تفسیر بدل جاتی ہے
مغفرت کے لیے جب بھی میں معافی مانگوں
نیکیوں میں مری تقصیر بدل جاتی ہے
شاہ قرآن کی تلاوت کے سبب ہی اکثر
اپنی باتوں کی تو تاثیر بدل جاتی ہے

ترے ہی نور سے پھیلا ہوا اُجالا ہے
ہر ایک سمت اسی نور ہی کا ہالا ہے
یہ روشنی جو زمانوں میں ساری پھیلی ہے
یہ سارا نور ترا ہی تو بس اُچھالا ہے
یہ تیرے ہونے کا دعویٰ بھی ہے، دلیل بھی ہے
ترے کرم نے ہر اِک موڑ پر سنبھالا ہے
میں تیری چاہ میں اتنا ہی جان پایا ہوں
ہر ایک شے میں چھپا تیرا ہی حوالا ہے
تری ہی شکر گذاری کریں یہی سچ ہے
جو کھا رہے ہیں ترا ہی دیا نوالا ہے
اُسی کی دین ہے اخلاق اُسی کی رحمت ہے
ہمارے ہاتھ میں جو معرفت پیالا ہے

یہ بدن ہے مرا سرائے روح
جس کو رب نے گھڑا برائے روح
کبھی کعبے کی بھی زیارت ہو
اور کبھی تو نور میں نہائے روح

نعت/ تفاخر محمود گوندل

میں مانگتا ہوں خدا سے فضا مدینے کی
کہ ہاتھ اُٹھتے ہیں جس وقت بھی دعا کے لیے

''تقدیس'' پڑھتے ہوئے آنکھیں بار بار بھیگتی رہیں اور میرے دل سے تفاخر محمود گوندل کے لیے ڈھیروں دعائیں نکلتی رہیں۔ نعت تفاخر کے اندر سے پھولوں کی بیلوں کی طرح پھوٹی ہے اور گلستانِ نعت کو مہکا دیا ہے۔ نعت لکھتے وقت اس نے اپنی کیفیات اور جذبوں کو لفظوں کے اندر اس طرح سمویا ہے کہ دھڑکنیں واضح سنائی دیتی ہیں۔ تفاخر محمود گوندل کی اس قدر سلیقے اور اہتمام کے ساتھ نعت لکھنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ خاص کرم سچے عاشقانِ رسول ﷺ پر ہوتا ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

افلاک سے بھی ارفع مدینے کی زمیں ہے
کیا اس کے مقابل بھلا فردوسِ بریں ہے
قربان ہیں جس ذاتِ گرامی پہ دو عالم
وہ کون زمانے میں سوا اس کے حسیں ہے
وہ قطرۂ شبنم ہو کہ ہو ذرّہ صحرا
چھو لے ترے نعلین کو وہ دُرِ ثمیں ہے
پہنچا ہو جو اک پل میں سرِ عرشِ معلّیٰ
مُرسل کوئی ایسا تو زمانے میں نہیں ہے
اے صاحبِ قرآن! عنایت کی نظر ہو
تیرے لیے بے چین مرا قلبِ حزیں ہے
اس قلب کی عظمت کا بیاں کیسے ہو ممکن
وہ جس میں بسا گنبدِ خضریٰ کا مکیں ہے
جس دل کو بھی مل جائے ترے در کی دولت
اس کے لیے پھر فتح مبیں فتحِ مبیں ہے
اس در کا تفاخر کو بھی دیدار ہوا ہے
جس در پہ جھکی رہتی ملائک کی جبیں ہے

مجھے زبان ملی آپؐ کی ثنا کے لیے
یہ فضلِ رب ہے تفاخر سے بے نوا کے لیے
میں جب سے دیکھ کے آیا ہوں گنبدِ خضرا
تڑپتا رہتا ہوں پھر شہرِ مصطفیٰؐ کے لیے
بلالؓ! تجھ پہ تصدق کہ تھا ترا پیکر
بنا ہی سرورِ کونینؐ کی وفا کے لیے
گدائے کوئے محمدؐ کی زندگی کیا ہے
فقط یہ جیتا ہے اللہ کی رضا کے لیے
لحد میں آ کے نکیرین کہ اٹھیں مجھ سے
تڑپ رہا ہے یہاں بھی تُو مصطفیٰؐ کے لیے
میں مانگتا ہوں خدا سے فضا مدینے کی
کہ ہاتھ اُٹھتے ہیں جس وقت بھی دعا کے لیے
روانگی ہو مدینے کو اب اگر لوگو!
تو لے کے جانا تفاخر کو بھی خدا کے لیے

مطلب نہیں ہے اب مجھے حور و قصور سے
لذت ملی وہ گنبدِ خضریٰ کے نور سے
دیکھی ہیں جب سے آپؐ کے روضے کی جالیاں
آزاد ہو گیا ہوں حریر و سمور سے
کرتا ہوں جب بھی مدحت و توصیفِ مصطفیٰؐ
الفاظ خود نکلتے ہیں میرے شعور سے
منظر بیان کیسے ہو مجھ سے وہ دوستو!
دیکھا جو عکس گنبدِ خضریٰ کا دور سے
اس کے نصیب میں ہیں زمانے کی ٹھوکریں
رہتا ہے جو بھی دور ہمارے حضورؐ سے
ہوتا ہے فرق کیسا کلیم و حبیب میں
پوچھے یہ کوئی جا کے ذرا کوہِ طور سے
ذکرِ نبیؐ کریں گے غلامانِ مصطفیٰؐ
محشر میں جب اٹھیں گے وہ اپنی قبور سے
مدّاحِ مصطفیٰؐ ہے تفاخر سا بے نوا
نعت عطا ہوئی ہے یہ ربِّ غفور سے

جس شخص کی آنکھوں کو ملے خاکِ مدینہ
آ جاتا ہے اس شخص کو جینے کا قرینہ
جچتے نہیں نظروں میں جہاں بھر کے گلستاں
مل جائے اگر سرورِ عالمؐ کا پسینا
بڑھ جاتی ہے تابندگی شمس و قمر بھی
ہر سال جب آتا ہے ولادت کا مہینا
اے سرورِ کونینؐ! عنایت کی نظر ہو
طوفاں کے تلاطم میں ہے اُمت کا سفینہ
وہ سینہ بھلا کیسے بنے مظہرِ توحید
جس سینے میں سرکارِ دو عالمؐ سے ہو کینہ
کیا شان بتاؤں میں ابوبکرؓ و عمرؓ کی
ہے اب بھی میسّر جنھیں قربت کا خزینہ
ہو جس میں بسی ذاتِ محمد ﷺ سے محبت
روشن ہے وہی قلب، وہی آنکھ ہے بینا
کیا بات تری سکنِ خورشیدِ رسالت
تُو خاتمِ دنیا میں زمرّد کا نگینہ
یہ گوشِ تفاخر میں کہا رحمتِ حق نے
توحید کی مے ساقیِ کوثرؐ سے ہی پینا

نعت

چاہے اچھا ہوں یا برا ہوں میں
اے رسولؐ خدا ترا ہوں میں
در و دیوار تیرے روضے کے
اپنی پلکوں سے چومتا ہوں میں
یا نبیؐ آپؐ کی بدولت ہی
اب کنارے پہ آ گیا ہوں میں
ذہن و دل میں بسے ہیں جب سے آپؐ
غم سے ناآشنا ہوا ہوں میں
لکھ کے دیوار و در پہ آپؐ کا نام
گھر کو پرنور کر رہا ہوں میں

شکیل سروش

حضورؐ پھر بھی بلا لیں ذرا مدینے میں
نمازِ عشق کروں گا ادا مدینے میں
ہے میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے میرے دل کا سکوں
ہے میرے درد جگر کی دوا مدینے میں
خدا کا شکر کہ ہو آیا ہوں مدینے سے
یہ اور بات کہ دل رہ گیا مدینے میں
ملی ہے روح کو تسکیں بڑا سرور آیا
حرم سے ہو کے میں جس دم گیا مدینے میں
ہیں جن کے زیرِ قدم دولتیں زمانوں کی
قدم قدم پہ ہیں ایسے گدا مدینے میں
میں بار بار ذکی کیوں نہ سر کے بل جاؤں
مری حیات کا ہے مدعا مدینے میں

رفیع الدین ذکی قریشی

روشنی ہے روشنی مہر و وفا کی روشنی
ہر طرف پھیلی ہے نورِ مصطفیٰؐ کی روشنی
میرے لب پر ذکر ہو ان کے درودِ پاک کا
دل میں ہو میرے سدا صلِ علیٰ کی روشنی
دو جہاں میں سب اسی کی ذات کا عرفان ہے
زندگی کی روشنی، ارض و سما کی روشنی
کیا حوالہ دوں میں ان کی عظمت کردار کا
کھائے پتھر جن سے ان کو دی دعا کی روشنی
نعت مولا لکھ رہا ہوں مدحتِ سرکار میں
کر عطا میرے قلم کو انتہا کی روشنی

راؤ وحید اسد

وہ جس کو خاکِ مدینہ سے پیار ہو جائے
اُسی پہ رحمتِ پروردگار ہو جائے
میرے کریم کرم ایک بار ہو جائے
سگانِ بطحا میں میرا شمار ہو جائے
بس ایک بار درِ مصطفیٰؐ پہ جا پہنچوں
حیات چاہے اجل کا شکار ہو جائے
مرے رسولؐ تری آل کی محبت میں
خدا کرے میرا سب کچھ نثار ہو جائے
ہوائے کوئے مدینہ کا یہ کرشمہ ہے
خزاں نصیب چمن سایہ دار ہو جائے
یہ معجزہ ہے ترے ذکر کا میرے آقاؐ
کہ بے وقار کرے باوقار ہو جائے
بھٹک رہا ہوں بڑی دیر سے اندھیروں میں
لباسِ تیرہ شبی تار تار ہو جائے
مرے نصیب میں رامش اگر ہو شہرِ نبیؐ
خزاں رسیدہ یہ دل پُر بہار ہو جائے

رامش منہاس

ہوئی ہے خدا کی عطا اللہ اللہ
کہ آئے رسولِ خدا اللہ اللہ
ہیں واللیل زُلفیں حسیں سے حسیں تر
ہے چہرہ حسیں والضحیٰ اللہ اللہ
خزانے عطا کر کے خوش ہو رہے ہیں
دیے جا رہے ہیں دعا اللہ اللہ
یہ اعجاز ہے آمدِ مصطفیٰؐ کا
ملی دو جہاں کو وفا اللہ اللہ
ترا اسم احمد جہاں سے حسیں ہے
یہی تو ہے ردِ بلا اللہ اللہ
ذرا دیکھ گھر آمنہ کے ہے آیا
زمانے کا حاجت روا اللہ اللہ
ہے آلِ محمدؐ کا فیضان عابدؔ
ملی دین کو جو بقا اللہ اللہ

محمود الحسن عابدؔ

ممتاز شاعر علی رضا کا
مرتب کردہ نعتیہ انتخاب
دُرود اُنؐ پر سلام اُنؐ پر
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
نستعلیق مطبوعات
3- فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

اقبال کا ایک خواب وحدتِ ملت

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

اقبال وہ خوش قسمت شاعر ہے جس کا ایک خواب الحمدللہ، قیام پاکستان کی صورت میں تعبیر پا چکا ہے اور دوسرا خواب یعنی وحدت ملت، ابھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ 10 ہزار سال پر پھیلی ملت کی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ''وحدت'' اس ملت کا رنگین خواب بھی رہا ہے اور سنگین المیہ بھی۔ ہمیں ہر دور میں ایسی بے خواب آنکھیں نظر آتی ہیں جو وحدت ملت کے اس رنگین خواب کو سمو کر سنگین المیوں پر آنسو بہاتی رہی ہیں۔ سیدنا ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوئی اور سیدالانبیاؐ کے صدقے ملت ابراہیمی کو رعنائی اور یکجائی نصیب ہوئی۔ پھر صدیوں تک کبھی فاتحین کی، کبھی مبلغین کی اور کبھی سیاسی رہنماؤں کی مساعی جمیلہ جاری رہیں، ان میں عہد حاضر کے وہ عظیم فلسفی، شاعر اور مصور مملکت خداداد، علامہ محمد اقبالؒ بھی شامل ہیں جنھوں نے لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند اور نیل کے ساحلوں تک ہر آنکھ میں ''وحدت ملت'' کا خواب بھر دیا ہے۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اگر چہ لمحہ موجود میں وحدت اسلامی کی صورتحال کچھ زیادہ خوش کن نہیں لیکن جو کچھ بھی ہے، حضرت علامہ اور ان جیسی دیگر محترم ہستیوں کی سعی پیہم ہی کا ثمر ہے۔ آپ وحدت اسلامی کے اس حیات افزاء پیغام کو ہندو پاکستان، ایران، افغانستان اور وسطِ ایشیاء کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک براہ راست پہنچانا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے زیادہ تر کلام فارسی زبان میں کہا ہے۔

حضرت علامہ کے نزدیک اسلام نہ تو قوم پرستی کے جذبے پر قائم ہے اور نہ ہی ملک گیری کی ہوس پر۔ یورشِ تاتار کا افسانہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ صنم خانوں سے بھی کعبے کے پاسبان پیدا ہو سکتے ہیں۔ قوم تو مذہب سے بنتی ہے، وطن سے نہیں صرف مذہب ہی فرد اور ملت کا رابطہ استوار رکھ سکتا ہے۔ بقول اقبال:

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

حضرت علامہ جان چکے تھے کہ مسلمانوں کی منفعت اور نقصان مشترکہ ہے مگر افسوس کہ یہ اللہ، نبیؐ، حرم پاک اور قرآن کی متفق علیہ بنیادیں ہونے کے باوجود فرقہ بندی، ذات، برادری اور رنگ و نسل میں تقسیم ہو چکی ہے۔ وہ خبردار کرتے ہیں

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
تُرکِ خر گاہی ہو یا اعرابی والا گُہر

توحید رب کبریا اور اس کا زندہ و تابندہ نشان، بیت اللہ، وحدت اسلامی کا ایک ایسا مضبوط ترین رشتہ ہے جو کسی اور قوم کو میسر نہیں

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

اسی نیوکلس کے گرد سارا عالم اسلامی رقص کناں ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان 24/7 اور 0/12 اللّٰھم لبیکَ کا ترانہ پڑھتے ہوئے کشاں کشاں کھنچے چلے آتے ہیں/ اس گھر کی پاسبانی امت اسلامیہ کیلئے باعثِ اعزاز ہے ورنہ ربِّ کعبہ تو ابابیلوں سے اور ہواؤں سے بھی اپنے گھر کا حفاظت کرا سکتا ہے۔

رسول محترم ﷺ کی روشن ترین حیات مبارکہ اور سنت مطہرہ، اتحاد اسلامی کی دوسری بڑی اساس ہے۔ سیدالانبیاﷺ دنیا کی وہ واحد ہستی پاک ہیں جن کی زندگی کے لمحہ لمحہ کا ریکارڈ موجود ہے، آپ کا خطبہ حجتہ الوداع عظمت انسانی کا منشور اولین ہے۔ نہ صرف مسلمانانِ عالم بلکہ بنی نوع انسان بھی اس پرچم کے تحت اکٹھے ہو سکتے ہیں:

بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

قرآن پاک خالقِ کائنات کا وہ لافانی پیغام ہے جو حضور خاتم النبیینؐ کے ذریعے امت مسلمہ کو عطا ہوا۔ یہ بھی وحدت ملت کی مضبوط ترین اساس ہے۔

ایں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت اُولا
نوع انساں را پیام آخریں حامل اُو

اگر مسلمانانِ عالم اللہ کی اس رسی کو مضبوطی سے تھام لیں تو ہمیشہ سرفراز و باکمال رہیں گے ورنہ تارکین قرآن ہو کر خواری و ذلت ہمارا مقدر بنی رہے گی۔ تبلیغ اور جہاد امت مسلمہ کے تنِ مردہ کو حیات نو بخشتے ہیں۔ خطبہ حجتہ الوداع میں سیدالانبیاءؐ نے جو فرمایا، اب اس پیغام کو حاضرین، تمام غائبین تک ہم پہنچائیں گے۔

اس امت کو نبیوں والا جو مبارک کام سونپا گیا وہ انہیں دنیا میں بھی سرفراز کرے گا اور آخرت میں بھی ان کی کرسیاں انبیاء کے ساتھ ہوں گی۔ حدیث پاک کا مفہوم ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

''اے اللہ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات سنے اور دوسروں تک پہنچائے''۔(۱)

اگر ہم اپنے زوال کے اسباب کا جائزہ لیں تو مختار مسعود کا یہ تجزیہ درست لگتا ہے۔

''جب حق کی جگہ حکایت اور
جہاد کی جگہ جمود لے لے
جب مسلمانوں کو موت سے
خوف آنے لگے اور زندگی
سے پیار ہو جائے تو صدیاں
یونہی گم ہو جاتی ہیں۔''(۲)

دینوی علوم وفنون میں کمال حاصل کرنا بھی ملت اسلامیہ کی تقویت کا باعث ہے۔مشرق سے ابھرتا ہوا سوج روز نیا پیغام دیتا ہے

علمِ اسماء اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است

لیکن جب عصر حاضر کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے تو اقبال خاکِ مدینہ ونجف کو سُرمہ بنانے کی نصیحت کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنے سے تازہ ہواؤں کے جھونکے آتے ہیں لیکن تاویل سے قرآن کے مطالب کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

اگر وحدتِ امت ایک کُل ہے تو اس کا جزو ہمارا گھر ہے۔اس گھر کی وحدت کی ضامن عورت ہے جو ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے روپ میں چراغ خانہ ہے، شمع محفل نہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے ہماری آج کی وحدت اسلامی کی صورتحالِ بہت اچھی نہ سہی مگر بہت بری بھی نہیں۔ہم ایک صدی میں آگے کی طرف بہت سا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔موتمر عالم اسلامی کے علاوہ تنظیم اسلامی کانفرنس ، ایکو (Eco) اور دیگر بہت سی بین الاسلامی تنظیمات اتحاد عالم اسلامی کے لئے کوشاں ہیں۔ضروری ہے کہ اس پراسس کو تیز تر کیا جائے۔اگر امریکہ کی باہم متحارب ریاستیں متحد ہو سکتی ہیں یا اہل یورپ دو خوفناک جنگیں لڑنے کے باوجود ایک پارلیمنٹ اور ایک کرنسی بنا سکتے ہیں تو اسلامیان عالم کیوں ایک نہیں ہو سکتے ہیں؟

حضرت علامہ انتشار امت کے اسباب کو کما حقہ سمجھتے تھے جس میں سے ایک بڑا سبب استعماری طاقتوں کی بندر بانٹ اور '' لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی بھی ہے۔

بقول اقبال:

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اے کہ نشناسی خفی راجلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

22 فروری 1974ء کو عالمگیری مسجد لاہور میں اکٹھے ہو کر ایک ہی صف میں نماز پڑھنے والے مسلمان ملکوں کے سربراہ خفیہ ہاتھوں نے ایک ایک کر کے شہید کرا دیئے لیکن روشنی کا سفر تیز ہوا سے رک نہیں سکتا ۔علامہ اقبالؒ نے ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ انشاءاللہ

آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کر ہے پھر برگ و بر پیدا
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

(۲۰۰۱ء)

حوالہ وحواشی

۱۔ صحیح بخاری شریف، کتاب العلم
۲۔مختار مسعود،'' آوازِ دوست''فیروز سنز۱۹۹۲ء لاہور

....

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمراء: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

عامر بن علی کی جہاں گردی

لبنیٰ صفدر/لاہور

کولمبس نے سفر کے دوران امریکہ کو ایجاد کر لیا تھا اور ابن بطوطہ نے سفر کے اس شوق کو زندگی کا مقصد بنا کر دنیا کی سیر کی۔ قدیم زمانوں سے ہی لوگ سفر کے رسیا رہے ہیں۔ مہم جوئی اور تجسس کی سرشت ازل سے انسان کے اندر موجود رہی ہے۔ کبھی جانوروں کو اپنی سواری بنا کر تو کبھی بادبانی جہازوں اور ملاحوں کے ساتھ شوقین سفر نت نئی زمینوں کا سراغ لگانے کے لیے جہازوں پر پرچم لہراتے سمندروں کے سینے چیرتے نکل جاتے تھے۔ جب واپس لوٹ کر آتے تو سفر کی یاد کے طور پر بہت سے تحائف اور خوبصورت داستانوں اور واقعات کا انبار اپنے ہمراہ لاتے۔ جنہیں لوگ حیرت وتجسس اور مسحور کن کیفیات کے ساتھ سنتے۔

دورِ جدید میں بھی سفرنامہ کی روایت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ادب میں ایک درخشاں باب کے طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ سفرنامہ نگار قدرے کم نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود خوبصورت سفرنامے گاہے گاہے اب بھی نگاہوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔

عامر بن علی جو کہ مشہور ادبی ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ صنف ادب کے تمام میدانوں کے شہسوار ہیں۔ آج کی مصروف ترین زندگی اور جاپان میں بہت بڑے بزنس کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ادب سے گہرا لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں۔ شاعری، انٹرویوز، کالمز، غرض ادب کے میدان میں منجھے ہوئے کھلاڑی کے طور پر کٹھن منازل کو مہارت اور سبک رفتاری سے سر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''آج کا جاپان'' ان کا خوبصورت سفرنامہ ہے جسے پڑھ کر قاری مزید متجسس ہوتا ہے اور کتاب کو ختم کیے بغیر اس کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔

حال ہی میں ان کا ایک اور نہایت خوبصورت سفرنامہ ''جہاں گردی'' شائع ہوا ہے۔ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ انتہائی دلچسپ انداز میں لکھا گیا سفرنامہ یقیناً شائقین ادب کو اپنے سحر میں جکڑ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آج بھی سندباد موجود ہیں۔ اگرچہ پہلے جیسی داستان سرائے نہیں لیکن داستان گو موجود ہیں۔ عامر بن علی سے ملاقات ہونے پر ان سے سفر کی مختلف داستانیں سن کر وہی لطف حاصل ہوتا ہے جن کے لیے پہلے دربار سجا کرتے تھے۔

دنیا کی سیر کرنے والے اس سفرنامہ نگار نے ''جہاں گردی'' کا انتساب پاکستان کی مٹی کے نام کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بارش کے بعد جس میں سے ایسی سوندھی خوشبو اُٹھتی ہے۔ جس کی پوری دنیا میں کوئی مثال نہیں۔ یہ ان کی اپنی مٹی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کتاب کا پہلا باب اپنے خوبصورت نام سے ہی مسحور کر دیتا ہے ''چیری کے پھول'' سفرنامہ تھائی لینڈ، چلی، امریکہ، جاپان اور لاطینی امریکہ کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔

عامر بن علی سفر کے دوران اشیاء اور ماحول کا طائرانہ جائزہ لے کر آگے نہیں بڑھ جاتے بلکہ بہت گہرائی اور حساسیت کے ساتھ ماحول اور رویوں کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں۔ چونکہ جاپان اور امریکہ میں زندگی کے کئی برس گزار چکے ہیں اور تہذیب وثقافت اور زبان وادب سے بھی گہری شناسائی رکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ نہ صرف خود سیکھتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ قاری بھی ان کے تجربات ومشاہدات سے مکمل حظ اُٹھائے۔

جہاں جاتے ہیں وہاں کا مکمل جغرافیہ اور تاریخ بھی رقم کرتے ہیں۔ ان کی تجسس بھری طبیعت اُنہیں جگہ جگہ کی خاک سے روایت و قدامت، تہذیب وثقافت کی خاک چھنواتی ہے اور اس خاک سے بالآخر وہ سونے کے بے شمار ذرات تلاش کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

سفرنامہ نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ قاری اس کے ساتھ ساتھ شریک سفر رہے۔ پڑھتے ہوئے لگے کہ وہ سفرنامہ نگار سے زبانی اس کے سفر کی روداد سن رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے سارے منظر دیکھ رہا ہے۔ منظر نگاری اور تصویر کشی کے فن سے بھی عامر بن علی بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ روکھے پھیکے انداز میں جغرافیہ اور ہسٹری کے دقیق ابواب نہیں لکھتے۔ بلکہ داستان اور ناول کی سی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو جملوں کی روانی اور الفاظ کا چناؤ شاعری کا سا حسن پیدا کر

دیتے ہیں۔ عامر بن علی چونکہ ایک خوبصورت شاعر بھی ہیں اسی لیے باقی اصناف میں بھی صنف سخن کا رچاؤ شامل ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ زمینی سفر میں جیسے جیسے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں ان کا تخلیقی شعور بھی اسی تیز رفتاری کے ساتھ ان کے ساتھ محوِ سفر نظر آتا ہے۔ وہ غیر ملکی معاشرت کی چیدہ چیدہ خامیوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں لیکن ان کی مثبت سوچ اور رویہ انہیں وہاں کی ترقی کی طرف زیادہ رجحان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ایک باب ''جاپان کی ترقی'' کا ذکر کرتے ہیں تو مرعوب ہو کر ان کے گن گانا شروع نہیں کر دیتے بلکہ یہاں بھی ملی جذبہ سرکش ہوتا دکھائی دیتا ہے اور وہ جاپان کے ساتھ ملک عزیز کے قیمتی سرمائے کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عالمی سطح پر کیے گئے کئی سروے بتاتے ہیں کہ دنیا کی ذہین ترین اقوام کے پہلے پانچ درجوں میں پاکستانی شامل ہیں۔ جاپان نے ترقی محنت کی وجہ سے کی اور ہم نے اس ہنر سے آنکھ چرائی۔

سادہ بات کو سادہ انداز میں بیان کرنا پسند کرتے ہیں۔ قاری کی دلچسپی کے لیے من گھڑت قصے کہانیاں بیان کرنا پسند نہیں کرتے۔ عامر بن علی کا تجربہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ ''جہاں گردی'' اس کا ثبوت ہے۔ عام اور روزمرہ میں ان کی گفتگو کی شائستگی اور لطافت ان کی تحریروں میں بھی اُبھر کر آتی ہے۔ وہ مغربی لباس زیب تن کرنے والا درویش ہے جسے اپنی ارتقائی منازل کا ادراک تو حاصل ہے لیکن وہ مادیت سے چشم پوشی کرتا آگے کی طرف بے نیازی کے ساتھ بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

اردو سفرنامہ کی تاریخ عامر بن علی کے سفرناموں سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ یقیناً یہ سفرنامے حال کے قاری اور مستقبل کے سفرنامہ نگار کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ عامر بن علی کے سفرنامے پڑھیے۔ آپ خود جان جائیں گے۔

اسپین (بارسلونا) میں مقیم پنجابی کے نامور شاعر
ارشد اعوان کا پہلا پنجابی شعری مجموعہ
''بلھے دا پنجاب''
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
صفحات: 128 قیمت: 300
ملنے کا پتہ: نستعلیق مطبوعات، لاہور
0300-4489310

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

اردو نثری نظم، شاعری یا غیر شاعری

ساحل سلہری/سیالکوٹ

جدید اردو نظم کی بات کریں تو آزاد نظم کے بعد ''نثری نظم'' ایک بڑا ہیئتی تجربہ ہے، اس ہیئتی تجربے کو جدید اردو نظم کا مزید ارتقا کہا جا سکتا ہے۔ پابند نظم کے دور میں غیر مقفیٰ نظم لکھنے کی بھی سخت مخالفت ہوئی کیوں کہ اس دور میں قافیے کے بغیر نظم نگاری کا رواج نہیں تھا، اس لیے نظمِ معرا کو غیر مروجہ قرار دے دیا گیا۔ از اں بعد آزاد نظم کے ساتھ بھی ایسا ہی عمل در پیش آیا کیوں کہ اردو شاعری میں عروضی تقسیم کی بھی روایت نہیں تھی، اس لیے آزاد نظم کو بھی آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا گیا اور اب یہی حال ''نثری نظم'' کا ہے۔

عہد حاضر میں متعدد شعرا اور ناقدین ''نثری نظم'' کو شاعری نہیں مانتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ نثر، شاعری نہیں ہو سکتی۔ نظم نگاری کی روایت کو دیکھیں تو پہلے نظم قافیے کی قید سے آزاد ہوئی، پھر متعین اور مروجہ عروضی نظام سے چھٹکارہ حاصل کیا اور اب نظم، نثری نظم کی ہیئت میں مکمل طور پر عروضی آہنگ سے آزاد ہو چکی ہے۔ نثری نظم غیر شاعر حضرات نے بھی کہنا شروع کر دی ہے۔ نثری نظم شاعری ہے یا غیر شاعری اس سے متعلق ڈاکٹر ضیا الحسن اپنی تصنیف ''جدید اردو نظم آغاز و ارتقا'' میں رقم طراز ہیں:

> ''نثری نظم اردو نظم کے ارتقا کی موجودہ کڑی ہے اگر ہم اسے نظم نہیں کہیں گے تو یہ نظم کے ارتقائی سفر سے باہر ہو جائے گی، مثلاً اگر اسے نثری شاعری کہیں تو یہ شاعری کے ارتقائی سفر کا اظہار ہے، نظم کے ارتقائی سفر کا نہیں، ویسے بھی اس قدر فروعی مسائل پر ہم نے پہلے ہی کافی وقت اور توانائی صرف کر دی ہے، اب ہمیں آگے کی طرف چلنا چاہیے۔ نثری نظم اور نظم کی دیگر ہیئتوں میں تخلیقی وژن کا اشتراک ہے۔ نظم زندگی کو جس زاویے سے دیکھتی ہے، غزل یا افسانے کے لیے ممکن نہیں ہے۔ نظم کا استعاراتی پیٹرن ہی فی الاصل نظم ہے۔ اگر عروض نظم ہوتا تو ہمارے عہد میں لکھی جانے والی ہر عروضی ''کاوش'' نظم ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے۔''(۱)

نثری نظم کے ابتدائی نمونے ساٹھ کی دہائی میں بھی ملتے ہیں لیکن اس بڑی ہیئتی تبدیلی کا باقاعدہ آغاز ۷۰ء کی دہائی سے ہوتا ہے، جب مبارک احمد نے نثری نظم پر مضامین لکھے اور خود بھی نثری نظمیں تخلیق کیں۔ مبارک احمد کو نثری نظم نگاری پر سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، ان کی اس ہیئتی تبدیلی کو شعری حلقوں نے یکسر مسترد کر دیا اور ان کی نثری نظموں کو غیر شاعری قرار دے دیا۔ اس ساری مخالفت کے باوجود نثری نظم نگاروں نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا، اسی دور میں نظم کے اہم شاعر عبدالرشید کا پہلا نثری نظموں کا مجموعہ ''اپنے اور دوستوں کے لیے نظمیں'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔

تین دہائیوں تک متنازع رہنے کے بعد اب اکیسویں صدی میں اسے صنف ادب کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اب ادبی جریدوں کو دیکھیں تو متعدد شماروں میں ایسے نثری نظمیں شائع ہو رہی ہیں کہ جیسے نثری نظم کو صنف شعر کا درجہ اور اعتبار و استحکام مل گیا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر چند عروضی شاعر بھی دل چسپی لے رہے ہیں، موجودہ دور میں نثری نظم کو اس قدر فروغ دینے کا باعث عروض سے ناواقف تخلیق کار ہیں جو اس ہیئت میں شاعری کر رہے ہیں۔ نثری نظم کے بارے میں ڈاکٹر ضیا الحسن مزید لکھتے ہیں:

> ''نثری نظم میں جہاں بہت اچھی شاعری کرنے والوں نے اپنا اظہار کیا، وہاں بہت سے عروض سے ناواقف شاعروں کو بھی ایک ایسی ہیئت میسر آ گئی جس کے لیے نہ کسی مطالعے کی ضرورت تھی نہ اکتساب کی۔''(۲)

اردو نظم میں نثری نظم کی ہیئت کے بعد کوئی بڑا ہیئتی تجربہ نہیں ہوا شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابھی تک تمام شعرا نے نثری نظم کو ''نظم یا شاعری'' تسلیم نہیں کیا اگر نثری نظم کو قبولیت عطا ہو جاتی یا اسے شاعری مان لیا جاتا تو شاید اس ہیئت میں نظم کا بڑا ذخیرہ ہوتا اور شعرا آگے کوئی نیا تجربہ کرنے کی جستجو بھی کرتے۔ آج بھی شعرا اور ناقدین نثری نظم کی تخلیق پر انگلی اٹھاتے ہیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

''مجھے دراصل نثری نظم کی اصطلاح پر اعتراض ہے۔نثر اور نظم آپس میں متضاد چیزیں۔میری رائے میں اسے نثری نظم کہنے کے بجائے اسے نثری شاعری کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' (۳)

ہمارے نثری نظم نگار(قدیم فکر میں کلام موزوں کونظم کہا جاتا تھا) اس سے اتفاق نہیں کرتے اس کے حمایتی کہتے ہیں کہ اگر نظم اور بحر واوزان لازم وملزوم ہوتے تو منظوم ڈرامے کو منظوم ڈرامہ نہیں بل کہ نظم کہتے۔روایتی ادب میں نثری نظم کا نام کبھی بھی اچھے لفظوں میں نہیں لیا گیا۔کیوں کہ اس ہیئت میں شاعر اور غیر شاعر کا امتیاز ختم ہوگیا ہے۔نثری نظم ''کلام موزوں'' نہیں اس لیے نثری شاعری ہے نثری نظم نہیں کہلاسکتی۔نثری شاعری، غیر عروضی شاعری، غیر عروضی نظم اور نثم کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

میں اپنی بند مٹھیاں کھول دوں گا
صبح کی دستک سے میری آنکھیں کھلیں
کراچی کے ساحلی سمندر سے
نیا سورج
ڈھل ڈھلا کے آیا
اور لاہور میں
میرے آنگن پر جھکا اور مسکرایا
''جس دن کا تمھیں انتظار تھا، وہ آگیا۔۔۔''
شام ہوئی
ساحلی سمندر کو متلاطم کرنے والے چاند نے
چہرہ نمائی کی، اور نوید دی
''جس رات کی تمھیں تمنا تھی، وہ تمھارے گھر کی دہلیز
پر ہے۔۔۔''
انور سن رائے میرے لیے پھیلتی روشنی اور سن رائز کا استعارہ
اور قمر جمیل چاندنی بکھیرنے والا حسین چاند ہے
میری ایک مٹھی میں روشنی، اور ایک مٹھی میں چاندنی ہے
میں راولپنڈی جا رہا ہوں
وہاں میں، جمیلہ سے پوچھوں گا
بتاؤ، میری مٹھیوں میں کیا ہے؟
اِس بات سے مجھے، پچاس برس پہلے، اپنی پیدائش کا دن یاد آتا ہے
میں نے ماں سے یہی سوال کیا تھا، کہ اُس نے کہا تھا، خالی ہیں
مجھے ماں سے بے حد پیار تھا
میں نے مٹھیاں نہیں کھولیں۔۔۔۔
میں ڈرتا ہوں، جمیلہ بھی یہی جواب دے گی
اور میں، مٹھیاں نہیں کھول سکوں گا
(مبارک احمد، دسمبر۱۹۷۴ء)

اردو شاعری میں غزل ایک مقبول صنف رہی ہے اور اس نے نظم کو ہر دور میں ہر قدم پر رد کیا ہے قلی قطب شاہ کی گیت نما نظموں سے لے کر پابند، معرا، آزاد اور نثری ہیئتوں تک نظم نگاری ہوئی ،غزل شعار معاشرے نے ان اصناف کو مقبول نہ ہونے دیا اور نظم نگار ہر دو تین دہائیوں کے اسے مقبول بنانے اور رائج کرنے کے لیے نت نئے ہیئتی اور موضوعاتی تجربات کرتے رہے۔نظم نگاروں کے ان ہیئتی اور موضوعاتی تبدیلیوں کے باوجود غزل مقبول صنف شعر رہی ہے۔اس تمام بحث کے بعد دیکھا جائے تو نثری نظم نصف صدی کا سفر طے کرنے کے باوجود بھی اعتبار حاصل نہیں کرسکی۔معدودے چند شعرا کے شعرا اسے شاعری تسلیم نہیں کرتے۔میری رائے میں نثری نظم غیر شاعری اور نثری نظم نگار غیر شاعر ہے،اس لیے پچاس سال گزرنے کے باوجود بھی نثری نظم مقبول اور رائج نہیں ہوسکی۔میرے نزدیک جو تخلیق غیر شاعر اور شاعر کا امتیاز ختم کردے وہ شاعری نہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ضیاالحسن ،ڈاکٹر،جدید اردو نظم آغاز وارتقا، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء)، ص:۳۰

۲۔ایضاً،ص۳۱

۳۔سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، ادب لطیف، (لاہور: شمارہ نمبر ۱۱۔۱۲،۱۹۷۵ء)، ص:۱۸

ماخذ: حنیف کیفی، ڈاکٹر۔اُردو نظم معرا اور آزاد نظم۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء

سروری، عبدالقادر۔جدید اردو شاعری۔لاہور: شیخ غلام علی سنز پبلشرز، ۱۹۶۷ء

ضیاالحسن، ڈاکٹر۔جدید اردو نظم آغاز وارتقا۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

فرمان فتح پوری ،ڈاکٹر۔اردو شاعری کا فنی ارتقا۔لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء

مبارک احمد۔کلیاتِ مبارک۔لاہور: مبارک پبلشرز، ۱۹۹۹ء

منیر الدین ،بدر۔بیسویں صدی کا شعری ادب۔ لاہور: پولیمر پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء

جدید غزل کی توانا آواز......علی آزر

قیصر مسعود/دوحہ

میں دلاور علی آزر کی پہلی دو تین غزلیں پڑھنے کے بعد ہی اس کی شعری صلاحیتوں کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ان غزلوں نے مجھے اس درجہ متاثر کر دیا کہ میرا تجسس مزید بڑھنے لگا اور پھر میں اس کی غزلوں کو تلاش کر کر کے پڑھنے لگا۔

روایت کی خوشبو سے معطر، جدید لہجے کی روشنی سے جگمگاتی اور زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ سے مسجع دلاور علی آزر کی شاعری بھرپور تغزل اور معنویت کی زرخیزیوں سے مالا مال ہے۔اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے حسیاتی پیکر کا پرمعنی اظہار اس کے تخلیقی جوہر کا کرشمہ ہے۔وہ فکر کی نئی منزلوں کا مسافر ، شعری نزاکتوں کا رمز شناس اور فنی باریکیوں کا ماہر ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری جدید لہجے کی حامل ہونے کے باوجود اپنے تمام تر آداب و تہذیبی روایات اور شعری جمالیات کے ساتھ سامنے آتی ہے۔اس کے ہاں لفظوں کی نشست و برخاست کا نظام اور چست مصرعوں کا التزام لفظی و معنوی سطح پر قاری کو متاثر کرتا ہے۔صوتی حوالے سے بھی اس کے اشعار خوبصورتی سے آواز کو تصویر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ اپنے فن شعر گوئی پر بجا طور پر نازاں بھی ہے اور پر اعتماد بھی۔مثال کے طور پر اس کے درج ذیل شعر دیکھیے جن میں وہ اپنے لفظ کی حرمت اور اپنی سخن سازی کے بارے کتنا پر اعتماد نظر آ رہا ہے

رشک آتا ہے اسے حرف سخن سازی پر
جب مرا مصرعہ ء تہہ دار کوئی سنتا ہے

یاقوت جڑے اور کہیں الماس اتارے
وہ لفظ جو ہم نے سر قرطاس اتارے

پاس ہے لفظ کی حرمت کا وگرنہ آزر
کوئی تمغہ تو نہیں ملتا غزل خوانی پر

جس احتیاط سے مصرعہ رفو کیا گیا ہے
میاں ! یہ شعر نہیں دل لہو کیا گیا ہے

کیسے پہچانتی ہے آنکھ نئے لفظوں کو
کیسے رم کرتی ہے آواز گلو میں اپنے

دلاور علی آزر کا استعاراتی انداز تغزل معاشرتی زندگی کے دکھوں اور غموں کی کیفیات کو جمالیاتی انداز میں پیش کرتا نظر آتا ہے۔غم چاہے عشق کا ہو یا معاشرے کا، ذاتی محرومیوں کا ہو یا اجتماعی ناہمواریوں کا وہ اسے نوحہ بنا کر آہ و زاری نہیں کرتا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اشعار جن میں کسی درجہ دکھ یا غم کا بیان ہے وہ ہلکی ہلکی چبھن بن کر دل کی لہروں میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔

آ دیکھ ذرا موسم گریہ کا نظارہ
شاخوں سے ہوا کیسے املتاس اتارے

اک درد ہمیشہ ہی رہا آنکھ میں اپنی
اک زخم ہمیشہ ہی رہا چاک سر خاک

چھوڑ کر جسم و جاں چلا جاؤں
زندگی میں کہاں چلا جاؤں

خاک ہونے سے لاکھ بہتر ہے
اشک کو خون میں ملا لیا جائے

دلاور کی شعری زبان اگرچہ غزل کی روایت سے جڑی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ متروک الفاظ و تراکیب سے دامن بچا کے چلتا ہے اور کہیں بھی ابلاغ کے سلسلے میں مشکل پسندی کا شکار نہیں ہوتا۔مروجہ تراکیب کو بڑے سلیقے سے استعمال کرتا ہے اور کبھی کبھی نئی تراکیب بھی اہتمام کے ساتھ تراش لیتا ہے۔اس کے مصرعے بڑے مرصع، سجے سنورے، حشو و زوائد سے پاک اور لفظوں کی نشست و برخاست کے لوازمات سے سجے ہوتے ہیں۔مجھے یہ کہنے میں کوئی دشواری نہیں کہ دلاور مصرع سازی کے حوالے سے اپنے ہم عصر شعرا کی پہلی صف میں ہے۔ دلیل کے طور پر اس کے چند مصرعے دیکھئے۔

☆سب اپنے اپنے طاق میں تھرا کے رہ گئے۔
☆ہوتی ہے نیند میں کہیں تشکیل خدوخال
☆لایا ہوں دشت نجد کا نقشہ اٹھا کے میں
☆جتنا میں اپنے آپ سے نالاں رہوں، رہوں
☆کوزہ گر مان یہ گارا نہیں روشن ہونا
☆بڑھنے لگا تھا نشہ تخلیق آب و خاک
☆یہ قیس کی مسند ہے سو زیبا ہے اسی کو
☆اک دن جو یونہی پردہ افلاک اٹھایا

دلاور علی آزر ایک ذہین اور مشاہدے کا شاعر ہے۔اس کی غزلوں میں جدیدیت اپنے بھرپور حسن کے ساتھ آمیخت ہوتی ہے۔برتے ہوئے مضامین سے دامن بچاتے ہوئے فکر کی نئی جہتیں تلاش کرتا ہے۔اپنا راستہ خود بناتا ہے اور اس پر کامیابی سے سفر کرتا ہے۔

آج کا دور قدروں کے زوال کا دور ہے۔تمام رشتے مادی اور اقتصادی سرو کار تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔نیکی، حسن، صداقت اور خیر کے جذبے زوال پذیر ہیں۔سرمایہ داری کے ظالم نظریے نے معاشروں کو زوال کی طرف دھکیل دیا ہے۔جس کے نتیجے میں زندگی خارجی، داخلی، روحانی اور اخلاقی سطح پر بے معنویت کا نمونہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔سماجی قدروں

کے اس زوال یافتہ دور میں یہ نوجوان قلم کار زندگی کی معنویت اور مستقبل کے امکانات کی بات کرتا ہے اور یہی اس قبیل کے شعرا کا کمال ہے۔

دلاور علی آزر کی غزل اس ماحول میں بھی نوحہ خوانی، قنوطیت، غم کی سطحیت اور روایتی رنج والم سے ماورا ہو کر تشکیک، قوت مشاہدہ اور آفاقی فکر سے تحریک لیتی ہے۔ میں دلیل کے طور پر دلاور کے کچھ اشعار آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مجھ کو تصویر بنانے میں رعائت جو ملے
نقشہء ارض و سماوات بدل سکتا ہوں

نیند میں کھلتے ہوئے خواب کی عریانی پر
میں نے بوسہ دیا مہتاب کی پیشانی پر

ہوتی ہے نیند میں کہیں تشکیل خال و خد
اٹھتا ہوں اپنے خواب کا چہرہ اٹھا کے میں

بھلا نظر بھی وہ آئے تو کس طرح آئے
مرا ستارہ پس کہکشاں نکلتا ہے

سطر در سطر یہاں لفظ سے لو پھوٹتی ہے
یہ جو تحریر ہے تصویر چراغوں کی نہ ہو

اٹھا کے ہاتھ پہ دنیا کو دیکھ سکتا ہوں
سبھی نظارے بس اک تھال میں پڑے ہوئے ہیں

تمام عکس مری دسترس میں ہیں آزر
یہ آئینے مری تمثال میں پڑے ہوئے ہیں

زمیں سے کوئی تعلق نہ آسمان سے ہے
مرا خمیر کسی تیسرے جہان سے ہے

یہ اک فقیر کا حجرہ ہے آ کے چلتے بنو
پڑی ہے طاق پہ دنیا اٹھا کے چلتے بنو

درون خواب نیا اک جہان نکلتا ہے
زمیں کی تہہ سے کوئی آسماں نکلتا ہے

یاقوت جڑے اور کہیں الماس اتارے
وہ لفظ جو ہم نے سر قرطاس اتارے

دلاور علی آزر بھرپور امکانات اک شاعر ہے۔لفظوں کے خالق نے اسے بھرپور ادبی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔اس کے پاس جوانی بھی ہے اور حوصلہ بھی، عشق بھی ہے اور فہم وادراک بھی۔ آنے والے دنوں میں وہ غزل کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرے گا۔اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔

میں اپنی راہ الگ سے بناؤں گا آزر
مری بلا سے کوئی کارواں چلا جائے

دریائے کرم ہم پہ بہا دیجیے داتا
سب رنج و الم دل سے مٹا دیجیے داتا

میں خواجہ اجمیر کا لایا ہوں وسیلہ
بگڑی ہے میری بات بنا دیجیے داتا

دیدار کے لائق میں نہیں لاکھ برا ہوں
حسرت ہے مجھے جلوہ دکھا دیجیے داتا

ہیں عرس کے لمحات خوشی رقص کناں ہے
رونق مرے دل کی بھی بڑھا دیجیے داتا

تشریف کسی رات مرے خواب میں لا کر
قسمت مری سوتی ہے جگا دیجیے داتا

مئے خوار بھی آپ کے جو آئے ہوئے ہیں
جام ان کو بھی عرفاں کے پلا دیجیے داتا

میں تلخی حالات کی ہو دھوپ میں کب سے
اب لطف و عنایت کی ردا دیجیے داتا

ہو چشم کی آپ کا دیکھوں رخ زیبا
تصویر مرے دل میں سجا دیجیے داتا

ہیں آپ حسیں آپ کا لاہور حسیں ہے
قدموں میں مجھے اپنے جگہ دیجیے داتا

محمد امین ساجد سعیدی/ حاصل پور

غزلیں

ترے پاس آؤں کہ جی چاہتا ہے
غم دل سناؤں کہ جی چاہتا ہے

بہت ہجر میں دردِ دل سہہ لیا ہے
تمہیں مل بتاؤں کہ جی چاہتا ہے

زمانہ ہوا تجھ کو دیکھا نہیں ہے
تجھے دیکھ پاؤں کہ جی چاہتا ہے

بہت دردِ دل عاصی لکھنے لگا ہوں
تجھے بھی سناؤں کہ جی چاہتا ہے

....

توبہ یہ تلواری آنکھیں
قاتل ہیں یہ تمہاری آنکھیں

جتنی آنکھیں میں نے دیکھیں
تیری سب سے پیاری آنکھیں

پل میں جادو کرتی جائیں
روشن اور کجلاری آنکھیں

اور بھی پیاری ہو جاتی ہیں
نیند سے بوجھل بھاری آنکھیں

آصف جاوید عاصی/ پیرس

علی اعجاز......ایک عہد

ڈاکٹر ایم ابرار/لاہور

علی اعجاز 21 اکتوبر 1942 کو قلعہ گوجر سنگھ لاہور کے ایک سیّد گھرانے میں پیدا ہوئے۔ منور ظریف سے دوستی کی وجہ سے گھر والوں سے چھپ کر سٹیج ڈراموں سے اداکاری کا آغاز 1960ء میں کیا۔ 1966ء میں پہلی فلم انسانیت ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے ریلیز ہونے کے بعد گھر والوں نے انہیں گھر سے نکال دیا۔

پی ٹی وی کے پہلے ڈراما ''لاکھوں میں تین'' میں ان کی اداکاری کو خوب سراہا گیا۔ علی اعجاز نے آغاز میں فلموں میں سپورٹنگ رول کیے لیکن 1979ء میں فلم ''دوبئی چلو'' نے انہیں ہیرو بنا دیا۔ ممتاز، انجمن اور رانی کے ساتھ ان کی جوڑی کو بہت پسند کیا گیا۔

مسٹر افلاطون، سوہرا تے جوائی، سالا صاحب کی کامیابیوں نے علی اعجاز کو صف اوّل کے اداکاروں میں لا کھڑا کیا۔ علی اعجاز اور ننھا کی جوڑی ہر فلم کی ضمانت سمجھی جانے لگی۔ ان دونوں کی برجستہ اداکاری کی وجہ سے بے شمار فلمیں ہٹ ہوئیں اور اس طرح پنجابی مزاحیہ سوشل فلموں کا دور پھر سے شروع ہوا جو منور ظریف کے انتقال کے بعد تعطل کا شکار تھا۔ 1986ء میں ننھا کی خودکشی کے بعد علی اعجاز نے پھر سے ٹی وی کا رخ کیا اور ''خواجہ اینڈ سن'' کی صورت میں ایک شاندار ڈراما اپنے مداحوں کو دیا۔ اس کے بعد ''مسکن''، ''شب دیگ''، ''کھوجی''، ''آپ کا خادم''، ''گرفت''، ''روگ'' اور کئی ڈرامے ان کی شہرت کو بامِ عروج پر لے گئے۔ علی اعجاز کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ریڈیو، اسٹیج، ٹی وی اور فلم میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ 1993 میں انہیں حکومت پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ ہمسایہ ملک بھارت نے بھی ان کی فنی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا ''کلچرل ایوارڈ'' دیا۔

1998ء میں فالج کے حملے نے انہیں فن اداکاری سے دور کر دیا۔ مگر صحت یابی کے بعد پرائیویٹ پروڈکشن کے ڈراموں ''امریکہ چلو''، ''اکبری اصغری'' میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس کے علاوہ ''نشہ جوانی دا'' اور ''محبتاں سچیاں'' فلموں میں اداکاری کی۔ ''محبتاں سچیاں'' ان کی آخری فلم ہے۔

آج کل علی اعجاز نے علی اعجاز فاؤنڈیشن نام سے ایک غیر سرکاری تنظیم بنا رکھی ہے۔ جس کے تحت وہ ''اولڈ ہوم'' بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مخیّر حضرات نے انہیں ایک پلاٹ کالا خطائی روڈ شاہدرہ اور ایک جوہر ٹاؤن لاہور میں خیرات کیا ہے۔ اس 21 اکتوبر کو علی اعجاز 75 سال کے ہو گئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ''لیجنڈ اداکار'' کو لمبی عمر عطا کرے۔ علی اعجاز اپنی سادہ طبیعت کی وجہ سے عوام میں آج بھی مقبول ہیں۔ آج بھی جہاں محافل میں تشریف لاتے ہیں ان محافل کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ ایسی ہستیاں ہمارا سرمایہ ہیں۔

اعظم سہیل ہارون/غزلیں

ایک دریا ہے میری آنکھوں میں
جو کہ بہتا ہے میری آنکھوں میں
کس کی مورت ہے غور سے دیکھو
کون رہتا ہے میری آنکھوں میں
مجھ کو للکارتا مرا دشمن
خون اُترا ہے میری آنکھوں میں
دیکھ سکتے ہو گر دکھاؤں گا
کون بہتا ہے میری آنکھوں میں
روٹھ جاتے ہو مجھ سے جب بھی تم
دیپ بجھتا ہے میری آنکھوں میں
دیکھ سکتے ہو درد کے آنسو
خون چھلکا ہے میری آنکھوں میں
وقت کیسا ہے آ گیا اعظم
اُس کا پہرہ ہے میری آنکھوں میں

....

بارش میں بھیگنے کی وہ عادت نہیں رہی
پہلی سی اب ہمیں بھی محبت نہیں رہی
غم ہائے روزگار نے یہ بھی ستم کیا
اک دوسرے سے ملنے کی فرصت نہیں رہی
رہتا تھا بن کے سایہ کبھی ساتھ جو مرے
وہ کہہ گیا کہ تیری ضرورت نہیں رہی
کس سمت جا رہا ہے زمانہ یہ دوستو
اب تو بزوں کی بھی کوئی عزت نہیں رہی
اعظم غموں نے کر دیا کمزور اس قدر
اب اور دکھ اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی

مائی چانن

انیلہ بھلر/امریکہ

چاند کی چودھویں تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں خاموش تھیں اور ہوا کی تھاپ سے پتے ہولے ہولے بول رہے تھے۔خاموشی سے لگتا تھا جیسے سارا گاؤں سو رہا تھا،لیکن نہیں کوئی تھا جو اندھیروں میں کسی کو تلاش کر رہا تھا،قبروں کے اندر وہ نظریں دائیں بائیں گھماتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا،چاندنی اسے رستہ دکھا رہی تھی پھر جیسے ہی وہ منزل پر پہنچا،ڈھیر ہو گیا ایک،ایک قبر کے آگے......

آنکھ سے کچھ ٹپکا،موتی تھا یا آنسو،اس نے چن لیا،وہ جیسے صدیوں سے بیٹھا تھا،ایک ٹوٹی ہوئی مسکراہٹ تھی جو اس کی شکست کا حال بیان کر رہی تھی ،خستہ حال مسکراہٹ،ٹوٹا پھوٹا انسان،مردہ حالت میں قبر کے کنارے بیٹھا تھا۔

''تو ناراض ہوتی تھی ناں کہ میں تجھ سے ملنے کیوں نہیں آتا،لے اب دیکھ!میں ہر چودھویں رات کو تجھ سے باتیں کرنے چلا آتا ہوں،لیکن تو نے جانے میں اتنی جلدی کیوں کی۔''

''اتنی جلدی تو ہوا میں دیا بھی نہیں بجھتا۔''

یہ کہہ کر اس نے قبر پر دیا روشن کر دیا۔

اب وہاں دو چاند روشن تھے،ایک آسماں پر ایک زمین پر......روشنی کچھ اور تیز ہو گئی تھی،دور سے کسی ریل کے گزرنے کی آواز نے فضا میں ہلچل پیدا کر دی وہ چپ تھا......اسے سکوت کا انتظار تھا......وہ ریل گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

اب وہ پھر بولنے لگا۔

''پچھلے ہفتہ حیدرآباد گیا تھا،تو بڑی یاد آئی، تیری چوڑیاں بھی،اس لیے وہاں سے آتے ہوئے یہ چوڑیاں لے آیا ہوں،نیلا تیرا رنگ کالا میرا رنگ۔''

آنکھ سے پھر موتی ٹپکا۔

اب اس کا سر قبر کے پیروں میں جھکا ہوا تھا ،کندھے ہل رہے تھے۔

آج کوئی رو رہا تھا۔

قبر کے کنارے......

....

''پنو!اگر دل کی کوئی شکل ہوتی،اس کا بھی کوئی منہ ہوتا ناں تو میرا دل بالکل چانن جیسا ہوتا۔''وہ فضاؤں میں جھانکتے ہوئی بولی۔

''مجھے پتہ ہے ناں انسان جس سے محبت کرتا ہے،اسی جیسا ہو جاتا ہے،اس جیسا بولنے لگتا ہے ،سوچنے لگتا ہے''

''نمو تو ہر وقت چانن کے نام کی تسبیح نہ پڑھتی رہا کر،تیری ماں کو یا تیرے باپ کو پھنک بھی پڑ گئی ناں کہ تو کہاں محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے تو پورے پنڈ میں قیامت آجائیگی،کئی گردنیں کٹیں گی،نہ تو رہے گی نہ ہی تیرا وہ چانن بچے گا۔''

''میں تو اُنج وہی نہیں رہی،نہ میرا وجود رہا ہے نہ ہی میری سوچ،پنو اب جب میں رہی نہیں تو مجھے مارے گا کون؟''

''نمو۔نمو۔نمو''کوئی پکار رہا تھا۔

''جا ماسی بلا رہی ہے،اب ماسی کے سامنے اپنا یہ منہ بند ہی رکھنا،میں چلی پانی بھرنے۔''

نمو اکیلی رہ گئی تھی۔

خیالات کی فضاؤں میں

اپنے چانن کے ساتھ۔

''نمو کے پیو،نمو کا رشتہ پکا کرنے میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے،سوکھتی جا رہی ہے،میں تو ڈرنے لگی ہوں،کہیں کوئی روگ ہی نہ لگا لے۔''نمو کی ماں ڈرنے لگی تھی۔

''میری نمو لاکھوں میں ایک ہے،بس ذرا چنگا رشتہ آیا تو بات پکی،تو فکر نہ کر،مجھے روٹی لا دے۔''

لیکن چنگا رشتہ کے انتظار میں،نمو نہیں تھی ،وقت گزرتا جا رہا تھا اور گزرتا جا رہا تھا۔

''نمو خورشید کا رشتہ آیا ہے،لندن میں ہے،محل جیسی کوٹھی ہے شہر میں،لمبی گاڑی ہے،سنا ہے ہر سال گرمیاں آئیں تو ملک سے باہر چلا جاتا ہے،اس کے کپڑوں پر کبھی شکن نہیں پڑتی،عیش کرے گی عیش۔''

''نمو تاں ساڑ تو اپنے آپ کو،جل رہی ہے تو مجھے پتہ ہے کیوں جلا رہی ہے تو خود کو،آخر ماں ہوں میں تیری چند سال اور گزر گئے تو کون بیاہ کرے گا اس مائی سے......

''مائی نہیں مجھے مائی چن بلا۔''

نمو خالی آنکھوں سے ہولے ہولے بولی۔

''پتہ نہیں کیا بولتی رہتی ہے۔''

''ماں تو نہیں سمجھے گی۔''

''نمو میری جان مائیں سب جانتی ہیں،تو سمجھتی ہے مجھے کچھ نہیں خبر،لیکن بس عزت کے مارے،شرم سے تجھے کچھ نہیں کہتی۔''

ماں پاس آکر بول رہی تھی۔

''کلمو ہی جس نے ویاہ کرنا ہوتا ہے وہ انتظار نہیں کرواتا۔''

وہ ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''نمو مان جا،ورنہ تیرے باپ نے خود ہی رشتہ پکا کر دینا ہے،ابھی تک تو میں سنبھال رہی ہوں،بعد میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔''

وہ اب بھی خالی آنکھوں سے ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
''پنو کچھ خبر ملی کہ چانن اگلی دفعہ کب آئے گا؟''
نمو ساگ کاٹتی ہوئی پنو سے پوچھ رہی تھی۔
''مجھے کیا خبر ملنی ہے اس منحوس مارے کی۔''
پنو غصہ میں تھی۔
''سن خبر دار جو چانن کے بارے میں غلط بولا تو۔ اسے دوبارہ منحوس مارا بولا تو میرا مرا ہوا منہ دیکھے گی۔''
پنو نے تیز نظروں سے نمو کو دیکھا، جو سفید بے داغ لباس میں بیٹھی آسمان پر چانن کو تلاش کر رہی تھی۔
''مر جائے گی اس کے پیچھے جو تیرا کبھی بھی نہ ہو سکا تو؟
''میرا نہ ہو سکا؟ میں تو شاید خوشی سے مر ہی جاؤں، اگر وہ میرا ہو جائے لیکن تو دیکھ پنو میں تو پوری کی پوری اس کی ہو چکی، یہ دیکھ میرے ہاتھ، میری آنکھیں، میرے بال، سب ہی تو چانن کا ہے، میرے پاس اب میرا ہے ہی کیا۔''
پنو اسے غور سے دیکھنے لگی۔
''تو اسے اتنا چاہتی ہے تو وہ تجھ سے ویاہ کیوں نہیں کر لیتا؟''
''پنو محبت اُس سے میں کروں اور ویاہ وہ مجھ سے کرے؟''
''ہاں یہی دستور ہے سارے زمانے کا'' پنو اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔
لیکن محبت میں انسان کی سمجھ بوجھ تو سب سے پہلے ختم ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد اسے کچھ نظر آنا بند ہو جاتا ہے، اور سنائی تو کبھی دیتا ہی نہیں ہے، نمو بھی کیسے کسی کی بات سمجھتی یا مانتی۔
چانن کس رستہ سے کب چل کے آتا ہوا نمو سے ملا تھا، اسے یاد نہیں، ہاں بس اسے لگتا تھا، اس کا چانن سے کوئی رشتہ تھا، کوئی پرانی رشتہ داری تھی، جسم سے محبت ہو، تو پیٹ کی بھوک کی طرح مٹ جاتی ہے، اور روح سے محبت تو آگ ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ دل کو جلاتی رہتی ہے وہ بھی جل رہی تھی۔
چانن کی تپش میں......
''پنو بندہ بڑا ہی عجیب ہوتا ہے، اسے اچھی طرح خبر ہوتی ہے کہ اس ساری کائنات کو بنانے والا ایک وہی رب ہے، پھر اس رب کو چاہے جس نام سے بلائے کسی کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔''
''تو جھلی ہو گئی ہے۔''
''ہاں شاید جھلی ہو گئی ہوں۔ ایسا جھلا پن تو صرف عاشقوں میں آتا ہے۔''
''دیکھ ہمیں رب سے جو مانگو ملتا ہے، ہندوؤں، سکھوں کو بھی ملتا ہے، چوروں کو بھی ملتا ہے۔''
''ہاں تو پھر۔''
''دیکھ جب رب ہے ہی ایک تو پھر دوسرا رب کیسے کسی کو کچھ دے سکتا ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو بھگوان سے ملتا ہے، تو پھر تجھے نہیں لگتا ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ دوسرا بھی کوئی رب ہے۔''
''نمو تو اب کسی کے ہاتھوں ہی ماری جائے گی۔''
''نہیں تو مجھے سمجھا ناں۔''
''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، ابھی جا کے اماں ابا کو روٹی بھی لگا کے دینی ہے۔''
''چانن تجھے پتہ ہے تو کتنے دن بعد آیا ہے۔''
وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے آخری بار دیکھ رہی تھی۔
''ایسے نہ دیکھ مجھے۔''
''پھر میں تجھے کیسے دیکھوں؟''
''تجھے پتہ ہے جب تو نہیں بھی ہوتا میں تو تب بھی صرف تجھے ہی دیکھتی ہوں اور ایسے ہی دیکھتی ہوں۔''
کچھ تھا اس کی آنکھوں میں، کوئی حسرت تھی یا کوئی خوف، شاید ان سے ملتا جلتا کوئی تاثر۔
''تو ایسے دیکھتی ہے تو کانپ جاتا ہوں، کچھ ہے تیری آنکھوں میں۔'' وہ بولا۔
''تو ہے ان آنکھوں میں چانن، تجھے میری آنکھوں میں، مجھ میں تیرے علاوہ کچھ نہیں نظر آئے گا۔'' وہ بولی۔
''تیرا وجود مجھ سے دور ہے، پر تو نہیں۔''
''مجھے تیرے جنون سے ڈر لگتا ہے۔''
''میرا یہ جنون تو تو آپ ہے، تو ہی ہے میرے اندر''
''تو جانتی ہے ہماری راہ میں بڑے پتھر ہیں؟''
''میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ اس راہ کی کوئی منزل نہیں۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہو بولی۔
''دنیا کی نظر میں ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔''
''رشتہ محبت کا ہو تو امر ہوتا ہے، اور دنیا کی پروا اب کسے؟''
''چانن تو عید کی طرح سال میں دو دفعہ ہی آتا ہے۔''
''روز روز آؤں گا تو محبت کم ہو جائے گی۔'' وہ مسکرایا۔
''روز روز ملنے سے محبت کم ہو جاتی ہے۔'' وہ بھی مسکراتی۔
''ہاں۔''
''بندہ دن میں 5 بار رب سے ملتا ہے، تہجد بھی پڑھتا ہے پڑھنے والا، پورا دن رب کے نام کی تسبیح پڑھتا ہے، پھر بھی رب سے محبت کم نہیں ہوتی۔''
''وہ تو رب ہے نمو۔''
''ان کا رب وہ ہے، میرا رب تو ہے۔''

''گناہ نہ کر۔''

''اب گناہ کیا، ثواب کیا، تیرا عشق ہی میری جنت ہے۔''

وہ نمو میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا، اس سے محبت تو تھی لیکن ایک ڈر تھا، زمانہ کا ڈر، ذات برادری کا ڈر، وہ اس سے چھپ چھپ کے ملنے آتا تھا، چھپ چھپ کے محبت کرتا تھا لیکن وہ نڈر تھی، بے باک اور دبنگ تھی۔

''نمو تو پھر اس سے ملی تھی۔''

''ہاں وہ آیا تھا۔''

''پھر کیا بولا اس نے۔''

''کچھ نہیں۔''

''نمو وہ مرد ہے، کچھ بھی کر لے زمانہ اسے قبول کر لے گا۔ لیکن تو؟ تیرا نام اک بار بدنام ہو گیا تو پھر کسی نے تجھ سے بات نہیں کرنی، ویاہ تو دور کی بات ہے۔''

''پنو میں ساری رات اسے دیکھتی رہی، پلک بھی نہیں جھپکی، وہ ڈر گیا تھا۔''

وہ خلاؤں میں دیکھتی بولے جا رہی تھی۔

اردگرد سے بے خبر، لاپروا۔

''وہ رشتہ کیوں نہیں بھیج دیتا، تیری عمر گزرتی جا رہی ہے۔''

''تو بھی تو کنواری ہے۔''

''ہاں لیکن مجھے تیری طرح کسی چانن کا انتظار نہیں۔''

''میرا انتظار بھی اب ختم ہونے والا ہے۔''

''کیا وہ رشتہ لے کر آنے والا ہے؟''

''نہیں پنو، کوئی نہیں آرہا، اب میں خود جانے والی ہوں''......

وہ کہاں جانے والی تھی۔

....

اماں اماں یہ مائی چن کون تھی، سارا گاؤں کہتا ہے وہ تیرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔

''وہ مائی چن نہیں تھی، میری نمو تھی، محبت نے اسے مائی چن بنا دیا۔''

''اماں بتا ناں ہوا کیا تھا اسے، وہ کیسے مری؟''

''اسے جنون تھا، چانن کا مر گئی وہ چانن چانن کرتے کرتے۔''

ماں کیسی تھی وہ۔

''سچی تھی، پاک تھی، کہتی تھی اب وہ خود جانے والی تھی، چلی گئی۔''

پنو کی آنکھ بھر آئی۔

''ماں چانن نے اس سے بیاہ کیوں نہیں کیا، وہ اسے ملا کہاں تھا؟''

''نمو چانن مجھے ہی کیوں ملا، کسی اور کے راستہ کیوں نہیں گیا۔'' پنو اسے پوچھتی تھی اکثر۔

''تیرے اس سوال کا جواب تو آپ پنو کے پاس بھی نہیں تھا۔''

''اس نے شادی کیوں نہیں کی نمو سے۔''

''پھر اماں اسے محبت کیسے ہوگئی۔''

''محبت کی آنکھیں نہیں ہوتیں پنو، محبت کا دماغ بھی نہیں ہوتا، اس کا تو صرف دل ہوتا ہے۔'' وہ کہتی تھی۔

''محبت کی کوئی ذات برادری نہیں ہوتی اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، محبت تو خود میں ایک ذات ہے، برادری ہے، مذہب ہے، مسلک ہے۔'' اس کا جنون بولتا تھا۔

''انسان کتنا بھی گناہ گار ہو، محبت میں شامل ہو جائے تو سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، محبت سارے گناہ دھو دیتی ہے، عشق پاک کر دیتا ہے۔''

''شوکی کتنا بڑا چور تھا، پورا گاؤں اس کے نام سے ڈرتا تھا، پھر اسے گاؤں کی کڑی سے محبت ہوگئی تو محبت نے اسے کتنا میٹھا کر دیا تھا، سارے گاؤں کے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا پھرتا ہے۔''

نمو کہتی تھی، مائی چن کہتی تھی۔

''ماں وہ دیکھنے میں کیسا تھا۔''

''پنو میں اس کو دیکھتی ہوں تو اس کو سجدے کرنے کو دل چاہتا ہے۔'' نمو کہتی تھی۔

''وہ ایسا تھا۔'' وہ بولی۔

''نمو کہیں تجھے کسی کی بددعا تو نہیں۔''

''تو خود چل کے اپنا مقدر خراب کر رہی ہے، مت ماری گئی ہے تیری۔''

''پنو جسے عشق ہو جائے اسے بددعا کچھ نہیں کہتی، مقدر بھی اس کے آگے ہار جاتے ہیں، عشق ہو تو عقل سے آگے نظر آنے لگتا ہے۔''

نمو مسکراتے ہوئے بولی، اس کی ہنسی میں ہوک اٹھ رہی تھی اس ہوک کو سننے کے لیے کان نہیں، دل کی ضرورت تھی، کچھ آوازیں دل کے کانوں سے سنائی دیتی ہیں۔

''نمو تو سن رہی ہے؟ اماں نے میری شادی طے کر دی ہے، اگلے 15 دنوں میں رخصتی ہے، اب تو بھی کچھ سوچ لے۔''

نمو خاموش نگاہوں سے پنو کو دیکھتی رہی، پنو اب نمو کے پاس آ گئی۔

''دیکھ نمو جتنی محبت تجھے اُس سے ہے اگر اس کو بھی ہوتی تو وہ روز تجھ سے ملنے آتا، اسے تیری ذرا پروا نہیں ہے، دیکھ تو سوکھتی جا رہی ہے، بیمار لگنے لگی ہے۔''

''ہاں عشق کی بیمار'' نمو سوکھی آواز میں بولی اب وہ بالکل تنہا ہونے جا رہی تھی، پھر میری شادی ہوگئی اور میں تیرے باپ کے ساتھ اس گھر آ گئی''

''پھر تو کم کم ملنے لگی ہوگی مائی چانن سے۔''
''ہاں پہلے ہر دن ملتے تھے ہم، پھر ہفتہ میں ایک۔''
''چانن آتا رہا؟''
''ہاں چانن اب ہر روز ملنے آتا ہے، ہم گھنٹوں باتیں کرتے ہیں، کیکر کے درخت کے نیچے، میں بولتی رہتی ہوں وہ سنتا رہتا ہے، دیکھ جب سے تو گئی ہے اسے میرا کتنا خیال آنے لگا ہے۔''
''نمو تو جھوٹ بول رہی ہے۔''
''مجھے سب خبر ہے کہ تو پورا پورا دن کھیتوں والی سڑک کے کنارے بیٹھی رہتی ہے۔''
پنو غصہ میں اونچا اونچا بول رہی تھی۔
نمو کی آنکھیں بند تھیں۔
''نمو رحم کھا اپنی ماں پر اپنے باپ پر، نہ ستا۔''
''پنو مجھ میں اب دم نہیں رہا'' وہ بولی بند آنکھوں سے وہ آیا تھا دیکھ اب جھوٹ نہ بولیں۔''
''نہیں'' آنکھیں اب بھی بند تھیں۔
''کوئی پیغام''
''پنو وہ آنے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔
لیکن اسے بس موقع ہی نہیں مل رہا''
''تو انتظار کرتی رہے گی۔'' پنو بولی۔
''ہاں۔''
''اور خالہ، چاچا مجھے ان کی فکر نہیں''
''انہیں کہہ دے پریشان ہونا چھوڑ دیں''
''ماں باپ ہیں ان کے بس میں نہیں''
''پنو میرے بھی تو بس میں نہیں۔'' وہ آنکھیں کھولتے ہوئے بولی۔
''بھول جا اسے خدا کے لیے۔''
''کئی لوگ محبت کرتے ہیں، بھول جاتے ہیں رستہ بدلتے ہیں تو پچھلی گلیاں بھول جاتے ہیں، نئی نئی منزلیں ان کو بلانے لگتی ہیں اور کچھ کے نصیب میں صرف بند گلیاں آتی ہیں۔''
''میں تو بند گلی میں ہوں پنو'' آگے جا نہیں سکتی اور پیچھے کون جاتا ہے، سب آگے جاتے ہیں۔''

....

ماں مائی چانن مری کیسے تھی؟
''انتظار کرتے کرتے'' پنو آنسو پونچھتے ہوئی بولی۔
''چانن کا انتظار۔''
''نہیں اپنی موت کا۔''
پنو اب مجھے بس اپنی موت کا انتظار ہے، کیا پتہ کب سانس بند ہو جائے، کوشش کرتی ہوں کبھی کبھی کہ رک جائے لیکن شیطان ہے پھر چل پڑتی ہے۔''
وہ نہیں آیا؟
''آیا تھا کل۔'' نمو بولی۔
''کیا کہہ رہا تھا۔''
''پنو وہ اب نہیں آئیگا، چانن اب کبھی نہیں آئے گا۔''
''ہائے میں مر جاؤں ایسا کہہ دیا اس نے۔''
''نہیں میں نے اسے منع کر دیا کہ اب نہ آنا۔''
''پنو اسے دیکھ کر جو سکون پہلے ملتا تھا اب بے سکونی میں بدل جاتا ہے، اس کے آنے کی حسرت اور ہے اور اس کے جانے کے بعد تنہائی کا عذاب بڑا ہی دکھ دیتا ہے۔''
''پھر اس نے کیا کہا؟''
''وہ مسکرایا تھا میری بات سن کے۔''
''تو تو کہتی تھی مجھے نہ دیکھے گی تو مر جائے گی۔''
''ہاں چانن اب میں تجھے نہ دیکھوں گی تو ہی مر وں گی۔''
''وہ مان گیا۔''
''اس کے پاس اور کر۔۔۔ کو تھا ہی کیا۔''
''ماں بس پھر وہ چلا گیا؟''
''ہاں''
''تو آخری بار کب ملی تھی مائی چانن سے''
''اس کے مرنے سے ہفتہ پہلے''
''اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی مردہ ہے، قبر سے باہر، اتنی کمزور ہوگئی تھی میری نمو۔''
''صدیاں گزر گئی ہیں چانن کو دیکھے، اس کی آواز سنے۔''
''تو نے خود ہی اسے آنے سے منع کر دیا تھا، اب وہ کیوں آئے گا۔''
''نہیں پنو اب وہ آئے گا۔''
اور پھر وہ مر گئی، یونہی سڑک کے کنارے۔
''ہوا کیا تھا؟''
''گاؤں میں شور تھا کہتے ہیں عشق ہو گیا تھا۔''
ایک آواز
''کس کے ساتھ'' دوسری آواز
''کوئی تھا پرلے گاؤں سے۔'' پھر کوئی بولا۔
''نام کیا تھا؟''
''سنا ہے چانن تھا۔'' پھر کسی نے کہا۔
''جاں سے لے گیا وہ نمو کو بیچاری چانن چانن کرتے کرتے مائی چانن ہوگئی۔''
''ماں اس کی قبر پہ دیا کون جلاتا ہے؟''
''چانن''
''ماں میں بھی جلا آیا کروں۔''
''ہاں''
یوں مائی چانن کی قبر پر ایک نہیں محبت کے کئی دیئے جلنے لگے۔

سیٹ بیلٹ

ایوب صابر/سعودی عرب

کاندھے پر بیلچا رکھے وہ راستے میں آنے والے ہر پتھر کو ٹھوکر مار کے اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سڑک پر گزرتی رنگ برنگی گاڑیاں جب ہارن بجاتیں تو اُن کی آوازیں اُس کے کانوں کو کاٹنے لگیں۔ قصائی کی دُکان کے سامنے کھڑا کتا اُس کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ اُس کا دل چاہا کہ اِس کتے کے جبڑے کانوں تک چیر دے۔ آج موسم بظاہر کافی خوشگوار تھا لیکن اُس کے اندر ویرانی سرایت کر رہی تھی اِس لئے اُسے موسم کے سہانے پن سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور ایسے میں پنواڑی کی دُکان پر کھڑے ایک آدمی نے پان کی پچکاری مار کر اُس کے کپڑوں پر نیا ڈیزائن بنا دیا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مُٹھیاں بیلچے کے دستے پر اور بھی مضبوط کر لیں، وہ ضبط کی آخری منزل پر تھا۔ قریب ہی پنساری کی دُکان پر رکھا ہوا طوطا پنجرے میں اللہ ھو کی رٹ لگا رہا تھا جو ہر گزرنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا، مگر وہ طوطے کی جانب بھی مائل نہیں ہو سکا۔

آج بھی مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے مزدوروں کے اڈے سے خالی ہاتھ مایوسی کا لبادہ اوڑھے مشتاق گھر لوٹ آیا۔ وہ اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا تا کہ اُس کی بیوی حنیفہ جلدی گھر لوٹنے کی وجہ نہ پوچھ لے۔ وہ صبح اِس امید کے ساتھ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا کہ واپسی پر کچھ سودا سلف لے کر آئے گا تا کہ گھر کا چولھا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ صحن میں کھیلتے 9 سالہ یاسر اور 7 سالہ ندا نے کورس میں آواز لگائی ابا آ گئے ابا آ گئے۔

''ابا! آپ آج بھی میری گڑیا نہیں لائے؟'' ندا نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور میرے لئے چابی والا بندر نہیں لائے؟'' یاسر نے گرہ لگائی۔

بچوں کی آوازیں سن کر حنیفہ دوپٹے کا پلو درست کرتی رسوئی سے نکلی، اُس نے صورتحال کا ادراک کر لیا تھا۔ ''ارے بچو! تمھارے ابا ابھی آئے ہیں، سانس تو لینے دو، آتے ہی فرمائشیں شروع کر دیں۔'' حنیفہ نے بچوں کو ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

وہ جانتی تھی آج بھی مزدوری نہیں ملی ہو گی، اِسی لئے مشتاق شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا۔ مشتاق صحن میں پڑی چارپائی پر بے بسی کے عالم میں بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر باپ کی طرح اپنے بچوں کی خواہشات پوری کرے لیکن یہاں تو پیٹ کا دوزخ بھرنا مشکل ہو رہا تھا، وہ بچوں کے لئے کھلونے کہاں سے لاتا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اِس طرح کیسے گزارہ ہو گا؟ اُسے مستقبل کے حوالے سے کوئی بڑا فیصلہ کرنا ہو گا۔ اِس ملک میں تو مزدوری ملنا بھی مشکل ہو گیا۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی نے غریبوں کی کمر توڑ دی۔ حکومت مزدوروں سے اِس طرح غافل ہو چکی جیسے مزدور اِس ملک کا کارآمد شہری ہونے کے بجائے معیشت پر بوجھ ہیں۔ ملکی کارخانے جو ترقی کا سب سے بڑا موجب تھے اُن کا پہیہ کوئی مزدور ہی گھماتا لیکن اپنے وطن میں مزدور کو مزے سے دور کر دیا گیا تھا۔ چمنی سے نکلنے والے دھوئیں سے مل مالک کے گھر میں دولت کی ریل پیل لیکن مزدور کے گھر بڑی مشکل سے چولھا جل رہا تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ بیرونِ ملک چلا جاؤں۔'' مشتاق نے حنیفہ سے مشورے کے انداز میں استفسار کیا جسے سن کر ایک پل کے لئے حنیفہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ شوہر کی جدائی کے خوف نے اُس کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب گھر کا گزارہ روز بروز مشکل ہو رہا تھا۔ حنیفہ نے بھی مجبوراً اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بیرونِ ملک جانے کے لئے وسائل کہاں سے آئیں گے۔ مشتاق کا دوست نوید ایک ایجنٹ کو جانتا تھا جو لوگوں کو بیرونِ ملک بھیجتا تھا اور اِس کے عوض دو لاکھ روپے پہلے وصول کرتا تھا۔ یہاں تو گھر کا چولھا گرم رکھنا مشکل تھا، اِس صورتحال میں بیرون ملک جانے کے لئے رقم کا بندوبست کس طرح ہو گا؟ مشتاق سوچ میں پڑ گیا۔

کافی سوچ بچار کے بعد مشتاق نے حنیفہ کو ایک تجویز دی۔

''ہماری گاؤں میں 2 کنال خاندانی زمین ہے، اگر وہ فروخت کر دی جائے تو رقم کا بندوبست ہو سکتا ہے۔''

''ہاں! یہی ایک آخری صورت ہے۔'' حنیفہ نے جواب دیا۔

مشتاق اگلے روز نوید کے پاس گیا اور اُسے مدعا

بیان کیا۔نوید نے اُس سے کہا ''تم کسی طرح دو لاکھ روپے کا انتظام کرلو، منصور خان سے میں خود بات کروں گا جوایک ریکروٹنگ ایجنسی کا مالک ہے، وہ تمھارے باہر جانے کا بندوبست کردے گا۔''

دو روز بعد دونوں مل کر منصور خان کے پاس گئے۔مشتاق تو منصور خان کے دفتر کی تزین و آرائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔اُس نے تمام صورتحال گوش گزار کردی۔منصور خان نے کہاتم رقم کا انتظام کرلو، جب انتظام ہوجائے تو پاسپورٹ بنواکر میرے پاس آجانا، میں تمھیں سعودی عرب بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔ مشتاق نے گھر آکر حنیفہ کوتمام احوال سے آگاہ کردیا۔ اُن کو ایسا لگ رہا تھا کہ اچھے دن آنے والے ہیں، غربت کی چادر بہت جلداُن کے سروں سے اتر جائے گی۔

مشتاق نے گاؤں کی زمین فروخت کر کے پیسوں کا انتظام کرلیا۔اُس نے پاسپورٹ بنوایا اور نوید کے ہمراہ جاکر منصور خان کورقم ادا کردی۔منصور خان نے دو ماہ کے اندراُسے سعودی عرب بھیجنے کا وعدہ کرلیا۔

مشتاق نے پاسپورٹ منصور خان کے پاس جمع کرانے کے بعد پھر مزدوری شروع کردی تا کہ سعودی عرب جانے تک گھر کے اخراجات پورے کرتا رہے۔دو ماہ اُس کے لئے خوشیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔وہ سنہری دنوں کی تلاش میں سعودی عرب جا رہا تھا۔سعودی عرب میں روزگار ملنا گویا اُس کے خوابوں کی تکمیل تھی۔مقامات مقدسہ کی وجہ سے سعودی عرب ہر مسلمان کے لئے متبرک مقام ہے۔وہ اکثر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کراُن محرومیوں کا ذکر کرتا جو آج تک حالات کی سنگینی کی وجہ سے روا رہی تھیں۔ اُسے روشن مستقبل اب بالکل قریب نظر آ رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ میں وہاں جاکر خوب پیسے کماؤں گا اور اپنے بیٹے کوانجینئر اور بیٹی کوڈاکٹر بناؤں گا۔اسی طرح کے خواب بُنتے دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔منصور خان نے اُسے فلائٹ سے دو دن پہلے اپنے پاس بلایا اور تمام تفصیل سے آگاہ کردیا۔

مشتاق نے بیگ میں چند کپڑے اور ضروری کاغذات رکھ لئے تھے۔وہ حنیفہ کو بار بارنصیحتیں کر رہا تھا بچوں کا خاص خیال رکھنا۔اِن کو کسی غلط بچے کی صحبت میں نہ بیٹھنے دینا۔میں سعودی عرب پہنچتے ہی کام پر لگ جاؤں گا اور تمھیں پہلے مہینے ہی ڈرافٹ روانہ کردوں گا۔وہ جانے سے پہلے گھر کے در و دیوار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اب یہی گھر اُس کا کل اثاثہ تھا۔

مشتاق نے سعودی عرب جانے سے پہلے محلے داروں سے ملاقات کی اور پڑوسیوں کوتاکید بھی کی کہ حنیفہ اور بچوں کا خیال رکھیں تا کہ اُس کی غیر موجودگی میں خاندان کوکوئی مشکل نہ پیش آئے۔بالآخر یاسر اور ندا کو گلے لگایا اور خوب پیار کیا۔بچوں کے چہرے اداس تھے۔حنیفہ کی بھی آنکھیں نم تھیں۔مشتاق اب منصور خان کے پاس جانے کے لئے گھر سے نکل پڑا۔ جب وہ دفتر پہنچاتو منصور خان نے اُسے ایک پیکٹ تھمادیا۔

''یہ پیکٹ تم اپنے ساتھ سامان میں حفاظت کے ساتھ لے کر سعودی عرب جاؤ گے۔'' منصور خان نے مشتاق کوحکم دیا۔

''جناب! اِس پیکٹ میں کیا ہے؟'' مشتاق نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جاننا تمھارا کام نہیں ہے۔اتنا سمجھ لو کہ یہ بہت قیمتی ہے اور تمھیں حفاظت کے ساتھ لے کر جانا ہے، وہاں پر میرا آدمی ائیر پورٹ کے باہر نکلتے ہی تم سے یہ پیکٹ لے گا۔'' منصور خان نے اُس کوگھورتے ہوئے کہا۔

اب مشتاق کو شک ہونے لگا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔اُس نے محسوس کیا جیسے اُسے پھانسا جا رہا ہو۔ اُس نے صورتحال کی سنگینی کو بھانپ لیا۔وہ اکثر اس طرح کے دھوکے کے بارے سن چکا تھا۔وہ جان گیا کہ اُس پیکٹ میں ضرور کوئی ممنوعہ شے ہے ورنہ اُسے کھول کر دکھادیا جاتا کہ اس کے اندر کیا ہے۔بالآخر مشتاق نے ہمت کر کے پیکٹ وصول کرنے سے انکار کردیا۔منصور خان کواندازہ ہو چکا تھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔اُس نے اپنے دو ملازمین کو اشارہ کیا جومشتاق کوپکڑ کرعقبی دروازے سے اندر لے گئے۔اُس کے بعد اُسے کسی غیر مانوس جگہ پر منتقل کر دیا گیا۔وہاں پر منصور خان اور کچھ دہشت ناک حُلیے کے لوگ موجود تھے۔منصور خان نے اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا ''یہ منشیات کا پیکٹ ہے، جو تجھے ہر حال میں ساتھ لے کر جانا ہے۔''

''میں منشیات لے کر سعودی عرب نہیں جا سکتا۔'' مشتاق نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''تمھارے انکار کو اقرار میں بدلنا ہمیں آتا ہے۔'' منصور خان نے خباثت بھرے انداز میں کہا۔

اِس کے بعد منصور خان نے اپنے آدمیوں سے کہا ''ذرا اِس کا دماغ تو درست کرو۔'' اب تین چار مُر گے مشتاق کوگھونسوں اور لاتوں سے مارنے لگے۔

مشتاق کسی فٹ بال کی طرح اچھل رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اُن لوگوں نے مشتاق کو مار مار کر ادھ موا کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اگلے دن اُسے ہوش آیا تو جسم چوٹوں سے دُکھ رہا تھا۔ اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اِس دوران ایک آدمی کھانا لے کر آیا۔ مشتاق نے جسم کا رشتہ زندگی سے برقرار رکھنے کے لئے کھانا کھا لیا۔ اُس نے کھانا لانے والے سے پوچھا ''یہ کون سی جگہ ہے اور مجھے یہاں کیوں قید رکھا گیا ہے۔'' اُس آدمی نے کہا'' میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا، جب باس آئیں تو اُن سے پوچھ لینا۔ مجھے صرف تمھیں کھانا کھلانے کی ذمہ داری دی گئی تھی جو میں نے پوری کر دی۔'' دوپہر کے بعد منصور خان آیا۔

''مشتاق! تمھارے پاس میری بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔'' منصور خان نے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ سجائے ہوئے کہا۔

''مجھ غریب پر رحم کرو۔ میں اپنے خاندان کا واحد سہارا ہوں۔'' مشتاق نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''میری بات مان لو تمھاری ساری غربت دور ہو جائے گی۔'' منصور خان نے اصرار کیا۔

''سعودی عرب مقدس سرزمین ہے، میں وہاں منشیات لے کر کیسے جا سکتا ہوں۔'' مشتاق بے بسی کے عالم میں گڑگڑا کر کہنے لگا۔

''جب لوگ اُس مقدس سرزمین پر منشیات کا استعمال کرتے ہیں تو کسی نہ کسی کو لے کر جانا پڑے گی۔'' منصور خان کے چہرے پر خباثت رقص کر رہی تھی۔

''منصور صاحب! آپ دوسروں کے بچوں کے لئے زہر بیچ رہے ہیں۔ وہ بھی تو آپ کے بچوں جیسے ہیں۔'' مشتاق نے جذباتی انداز میں کہا۔

''جب اُن کے والدین کو اپنے بچوں کی فکر نہیں تو میں کیوں اُن کے لئے پریشان ہوں۔'' منصور خان نے دلیل پیش کی۔

مشتاق نے کچھ بولنا چاہا لیکن منصور نے ہاتھ کے اشارے سے کہا'' بس اب کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم میری بات غور سے سن لو۔ تمھاری فلائٹ کی تاریخ ایک ہفتہ آگے بڑھا دی گئی ہے۔ اُس کے بعد تم ہر حال میں سعودی عرب جاؤ گے ورنہ یاد رکھو، میرے آدمی تمھارے گھر کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں۔ میں تمھیں تین لاشوں کا تحفہ نہیں دینا چاہتا۔'' یہ بات سن کر مشتاق کی روح تک کانپ گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگا لیکن منصور خان جیسے جلاد کے سینے میں دل کی جگہ پر پتھر رکھا تھا، اُسے کیسے رحم آتا۔ اُس نے مشتاق سے کہا'' یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میرے آدمی تمھارا خیال رکھیں گے اور کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کی تو اپنے خاندان کے انجام کے بارے میں سوچ لینا۔''

ایک ہفتے بعد مشتاق کو کسی قیدی کی طرح ائیر پورٹ لایا گیا اور مدینہ منورہ جانے والی قومی ائیر لائن کی پرواز کا ٹکٹ اور پاسپورٹ حوالے کر دیا گیا۔ ایک ملازم نے مشتاق کا بیگ پکڑ کر اُس کے کاندھے پر ڈال دیا۔ مشتاق کو اپنے انجام اور خاندان کی سلامتی کی فکر لاحق تھی۔ اُس کی منزل مدینہ منورہ تھی۔ یہ کیسا سفر ہے کہ مدینے کی طرف جاتے ہوئے ایک مسلمان کے قدم رک رہے تھے۔ اُس نے سوچ لیا کہ امیگریشن حکام کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دے گا۔ اُسے اپنی بے گناہی پر یقین تھا۔

پھر یہی ہوا، مشتاق نے اپنے بیگ میں رکھے منشیات کے پیکٹ کے بارے میں امیگریشن افسر کو صاف الفاظ میں بتا دیا۔ امیگریشن افسر نے اُس کی بات اطمینان سے سنی اور ایک ملازم کو حکم دیا'' اِس آدمی کی نگرانی کی جائے اور اِسے اپنی تحویل میں لے کر جہاز پر سوار کرایا جائے۔'' اُس کے بیگ پر نام کا ٹیگ لگا کر جہاز کے سامان میں جمع کر دیا گیا، صرف ایک چھوٹا سا پرس اُس کے پاس تھا جس میں پاسپورٹ ٹکٹ اور کچھ روپے تھے۔ تب مشتاق کو اندازہ ہو گیا کہ کسٹم افسران بھی منصور خان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ منصور خان کے ہاتھ کس قدر لمبے تھے۔ اُس نے ائیر پورٹ حکام کو بھی خریدا ہوا تھا۔ اِس سے صاف ظاہر تھا کہ منشیات سے حاصل ہونے والی آمدنی نشے کے سوداگروں سے لے کر سہولت کاروں کے درمیان تقسیم ہوتی تھی۔ سیکیورٹی ملازم کی نگرانی میں مشتاق کو جہاز کے اندر زر خرید غلام کی طرح سوار کیا گیا۔ وہ اپنی اور خاندان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں جس مقدس سرزمین پر جا رہا ہوں وہاں میری سچائی رنگ لائے گی۔

مشتاق عجیب کرب سے گزر رہا تھا۔ سوچوں کا تانا بانا بنتے وہ مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ جب جہاز رکا تو اُسے ایسا لگا کہ جہاز کے ساتھ اُس کے دل کی دھڑکن بھی رک گئی۔ وہ متوقع صورتحال کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔ اُس نے سعودی کسٹم افسر سے بات کرنا چاہی جو اردو زبان سے نابلد تھا۔ کسٹم افسر نے ائیر پورٹ پر کام کرنے والے پاکستانی لوڈر کو بلا کر مترجم کا کام لیا۔ مشتاق نے کسٹم افسر کو واضح الفاظ میں بتایا کہ اُس

کے بیگ میں منشیات کا ایک پیکٹ ہے جو اُسے یرغمال بنا کر اپنے ساتھ سعودی عرب لانے پر مجبور کیا گیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میری اور میرے خاندان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ کسٹم افسر نے منشیات کی موجودگی کے علاوہ مشتاق کی کسی بات پر یقین نہ کیا اور اُسے پولیس کے ذریعے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

مشتاق سوچ رہا تھا کہ مدینہ منورہ دنیا کی پہلی اسلامی ریاست کا مرکز ٹھہرا، یہاں اُس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ وہ شہر مدینہ جس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر مشتاق جوان ہوا تھا، آج اُس مدینہ منورہ میں اُسے پابندِ سلاسل کر دیا گیا تھا۔ وہ اِس مقدس شہر میں آ کر بھی گنبدِ خضراء کے نظارے سے محروم تھا۔ وہ روضہء رسول پر حاضری کا مشتاق تھا لیکن اُس کی آزادی سلب کر لی گئی تھی۔ اُس نے سنہری دنوں کی تلاش میں بیرونِ ملک جانے کا قصد کیا تھا لیکن آج روضہء انور کی سنہری جالیوں کو چھونا تو دور کی بات ایک نظر دیکھنے سے بھی محروم تھا۔

مشتاق چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ میں بے گناہ ہوں لیکن اُس کی سچائی جیل کی بلند و بالا مضبوط دیواروں سے ٹکرا کر دم توڑ گئی۔ اُسے منشیات فروشوں کے آلہ کار کے طور پر عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ اُس نے ہمت نہیں ہاری اور جیل سے اپنی آواز پاکستانی ایمبیسی تک پہنچا دی۔ اِس کے علاوہ جیل سے رہا ہونے والے ہر پاکستانی قیدی سے التجا کرتا کہ تم جیل سے باہر جا کر میری آواز پاکستانی انسانی حقوق کی تنظیموں تک پہنچا دینا تا کہ کوئی تو میری بے گناہی کو عدالت میں ثابت کرنے میں مدد کرے اور اِس گھناؤنے کاروبار میں ملوث چہروں کو بے نقاب کر سکے۔

مشتاق کو سعودی عرب گئے تین ماہ گزر چکے تھے لیکن ابھی تک حنیفہ کو کوئی خبر نہ ملی، اُسے مشتاق کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی۔ وہ نوید کے پاس گئی اور اُسے اپنی پریشانی سے مطلع کیا۔ نوید بھی حیران تھا کہ ابھی تک کوئی فون کال یا خط موصول نہیں ہوا۔ وہ دونوں مل کر منصور خان کے پاس گئے اور مشتاق کی بابت دریافت کیا لیکن منصور خان نے تُرخانے کے انداز میں کہا ''وہ مشتاق کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میرے آفس دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں، اگر مجھے کوئی خبر ملے گی تو تم لوگوں کو اطلاع کر دوں گا۔'' گھر میں بھوک نے ڈیرہ لگا لیا تھا۔ حنیفہ نے اپنی چاندی کی بالیاں فروخت کر کے ایک سلائی مشین خرید لی تھی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے خاوند کی سلامتی کی دعائیں کرتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ مشتاق نے جیل سے رہائی پانے والے ایک قیدی کو اپنے گھر کا ایڈریس دیا اور درخواست کی کہ پاکستان جا کر میرے خاندان سے ملاقات کرنا اور تمام صورتحال سے اُن کو آگاہ کرنا۔ اُس آدمی نے ایک ہفتہ بعد جا کر اُس کی بیوی کو تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ آج جب حنیفہ کو خاوند کے بارے معلوم ہوا تو آنکھوں کے آگے بندھ باندھنا مشکل تھا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

بالآخر مشتاق کی تگ و دو رنگ لائی اور تقریباً چھ ماہ کے بعد اُس کا مقدمہ منظر عام پر آ گیا۔ پاکستان ایمبیسی کے کمیونٹی ویلفیئر کونصلر نے مدینہ منورہ جا کر مشتاق سے ملاقات کی اور تمام صورتحال کا جائزہ لیا تو پاکستانی ایمبیسی کو مشتاق کی بے گناہی کا یقین آ گیا۔

مشتاق پانچوں وقت مسجد نبوی سے آنے والی اذان کی آواز سنتا تو اُس پر رقت طاری ہو جاتی، اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ مدینہ منورہ میں قیام کے باوجود وہ امام الانبیاء کے روضے پر حاضری کی قدرت نہیں رکھتا، اُسے اپنی قید اور بے بسی پر رونا آتا تھا لیکن اُس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ مشتاق کو یقین تھا کہ مدینے کی عدالت سے آج تک کسی بے گناہ کو سزا نہیں ہوئی، وہ بھی ایک دن سرخرو ہو گا۔ وہ ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر خالق کائنات کے حضور دُعائیں کرتا جو سب کا مشکل کُشا ہے۔

سفیرِ پاکستان کی خصوصی توجہ اور کمیونٹی ویلفیئر اتاشی کی انتھک کوششوں سے عدالت نے مشتاق کے مقدمے کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ بالآخر مشتاق کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے عدالت نے اُسے رہائی کے بعد وطن واپس بھیجنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ مشتاق کو پولیس کی نگرانی میں مدینہ منورہ ایئر پورٹ لایا جا رہا تھا۔ جب گاڑی مسجد نبوی کے قریب سے گزرنے لگی تو فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے جگمگاتی روشنیوں میں گنبدِ خضرا کا نظارہ کیا۔ مشتاق کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ مسجد نبوی کے بلند و بالا دلکش میناروں کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ایک اندھیری رات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور صبح کا اجالا نمودار ہونے والا تھا۔ وہ جہاز میں سوار ہوا تو ''سیٹ بیلٹ'' میں خود کو قید کر کے آزاد محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔

آتشِ عشق

محمد حسنین صابر/خیر پور ٹامے والی

میں بہاولپور میں رہائش پذیر تھا لیکن میرے خیر پوری دوست زیادہ تھے۔ جب رات کے دس بجے تھے میں بیڈمنٹن کھیل کر واپس آیا تو مہر اقبال سیال صاحب بیٹھک میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ باتوں سے میں نے محسوس کیا اقبال سیال صاحب حسب معمول مسکرا نہیں رہے بلکہ باتیں کرتے کرتے کہیں کھو جاتے ہیں۔ میں نے اقبال صاحب سے پوچھا کہ میرا دوست آج اتنا اُداس کیوں ہے۔ اقبال سیال نے کہا کہ ہم نے اپنے رعایا کی ایک جوان بچی کو جس کے دونوں پاؤں سیاہ ہو گئے تھے اور پاؤں کا چمڑہ گل کر اُترنے لگ گیا تھا بہاولپور کی سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کرایا۔ تین روز داخل کرنے کے بعد آج ہسپتال والوں نے جواب دے دیا ہے کہ بچی کے دونوں پاؤں کاٹنے پڑیں گے۔ اگر پاؤں نہ کٹوائے گئے تو بچی کے جسم میں زہر پھیل جائے گا۔ بچی کی جان کو خطرہ ہے۔ بچی اپنے بھائیوں سے کہتی ہے کہ میرے دونوں پاؤں کٹوا دیے جائیں میری جان تو بچ جائے گی۔ میں بچیوں کو قرآن مجید پڑھا کر گزارہ کر لوں گی لیکن بچی کے بھائی بچی کو گھر واپس لے گئے ہیں نہ جانے کیوں بچی کے بھائی بچی کو جان سے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جب میں بچی کی جوانی اور اُسکی بیماری کو دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ اس کے کافی عرصہ بعد تک اقبال سیال صاحب سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ ایک روز بہاول پور کی شاہی بازار میں اچانک اقبال صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ بیمار بچی کے بارے میں پہلے ہی میرے ذہن میں تھا۔ میں نے اقبال صاحب سے پوچھا کہ بچی کا کیا حال ہے۔ اقبال صاحب نے بتایا کہ اللہ میاں کا شکر ہے چچا رمضو جراح کے علاج سے بچی بالکل صحیح

ہو چکی ہے۔ عزیز بودلہ صاحب اور کچھ دوستوں نے بات اس انداز سے کی کہ میں چچا رمضو جراح کی مسیحائی کا قائل ہو گیا۔ میرے نانا ابو کے دائیں پاؤں میں زخم تھا۔ جو کافی عرصہ سے ٹھیک نہ ہو رہا تھا۔ میرے ماموں ان کا علاج کرا رہے تھے لیکن زخم ٹھیک ہونے کے بعد پھر خراب ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ میں بستی بہلی کے قریب دریائے ستلج کے کنارے جا کر چچا رمضو جراح سے اپنے نانا ابو کے پاؤں کا علاج کراؤں گا۔ جب ہم چچا رمضو کے ہسپتال پہنچے تو وہ تین کچے کشادہ کمروں اور ایک بڑے برآمدے پر مشتمل تھا۔ ہسپتال کے قریب ایک سفید رنگ کی مسجد بھی تھی۔ ہسپتال کے نیچے شمال کی جانب دریائے ستلج بڑی شان کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ چچا رمضو ایک شاندار آدمی تھا۔ جو اپنے فرمانبردار بیٹے کے ہمراہ دن رات مریضوں کے علاج معالجے میں لگا ہوا تھا۔ چچا رمضو کے پاس زیادہ بگڑے ہوئے زخموں یا خطرناک سانپوں سے ڈسے ہوئے مریض تھے۔ جو بڑی تیزی سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ چچا رمضو نے میرے نانا ابو کا زخم چیک کیا اور کہا کہ تمہارا نانا شوگر کے مریض ہیں۔ زخم ٹھیک ہونے میں تین ماہ کا عرصہ لگے گا۔ آپ میری ہسپتال میں رہائش اختیار کر لیں یا قریبی بستی محبت پور میں کوئی کرایہ کا مکان لے لیں۔ زخم کو روزانہ چیک کرنا پڑے گا۔ ایک دن تو ہم ہسپتال میں رہے۔ دوسرے دن اپنی آسانی کے لیے ہم نے محبت پور دریا کے کنارے ایک مکان کرایہ پر لے لیا جس کی کھڑکی دریا کی جانب کھلتی تھی۔ میں بہاولپور میں بیڈمنٹن کھیلنے کا عادی تھا لیکن بستی محبت پور میں بیڈمنٹن کھیلنے کے مواقع نہ تھے اس لیے میں صبح شام سرسبز کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں دریائے ستلج کے کنارے گھومنے پھرنے کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ اس سیر و تفریح کے دوران میری ملاقات زمیندار جابر خاں کے بیٹے پنل کمال سے ہوئی۔ پنل کمال سات یا آٹھ جماعت پڑھا ہوا ایک مضبوط اعصاب کا نوجوان تھا۔ وہ بھی سیر و تفریح کا شوقین تھا۔ پنل کمال سے میری دوستی بڑھنے لگی اور ہم ہر وقت اکٹھے نظر آنے لگے۔ ایک دن میں اور پنل کمال صبح

کی سیر سے واپس آ رہے تھے میری نظریں جھکی ہوئی تھیں کہ پنل کمال نے مجھ سے کہا کہ سامنے آنے والی شہزادی جمیلہ جتنی خوبصورت عورتیں کیا تمہارے شہروں میں بھی بسا کرتی ہیں۔ جب میں نے سامنے دیکھا تو دنیا کی انتہائی حسین ترین عورت میرے سامنے آ رہی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ صرف خوبصورت نہیں تھی۔ بلکہ بے انتہا خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت عورت پہلے میری نظروں سے کبھی بھی نہیں گزری تھی۔

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ میں بالکل خاموش سا ہوگیا۔ کسی مقناطیسی اثر کے تحت میرے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ جب وہ عورت ہم سے کچھ دور ہوگئی میں نے پنل کمال سے ٹھنڈا سانس لے کر کہا پنل کمال اس جیسا ملکوتی حسن شہر کے سنگلاخ مکانوں اور دھویں سے بھری ہوئی سڑکوں پر بھلا کہاں؟

ایسا بے مثال حسن تو اس رواں دواں ستلج کے پانی اور سرسبز کھیتوں کے قریب ہی ہوسکتا ہے۔

میں نے کہا یار پنل مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری تمام زندگی اب اس بستی میں اور ان کچے راستوں پر گزرے گی۔ پنل کمال مسکرایا۔ اُس نے کہا اس شمع پر کئی پروانے جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ چلو تم بھی قسمت آزما کر دیکھ لو۔ ابھی ہم یہی باتیں کرتے بستی کی جانب جا رہے تھے کہ بستی میں عورتوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم دیکھ رہے تھے گھر کی دیوار سے دو عورتوں نے سر نکالا ہوا تھا۔ باہر کھڑی پانچ چھ عورتوں سے گندے گالی گلوچ کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ پنل کمال نے کہا کہ ہمیں اپنا راستہ تبدیل کر لینا چاہیے۔ واپس اُوپر کا راستہ لے کر ہم اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمارا راستہ یہیں سے قریب اور سیدھا ہے۔ ہم اسی راستے سے چلیں گے۔ عورتیں لڑ رہی ہیں تو لڑنے دو ہمیں کیا۔ پنل کمال نے مجھ سے کہا یار ضد نہ کرو۔ ان میں سے ایک عورت تمہیں دیکھ کر دوسری عورت سے ضرور کہہ اُٹھے گی کہ یہ شہری پتلون اور سنہرے چشمے والا تم سے ملنے کے لیے تو آ رہا ہے۔ تم نے ہی تو اسے بلوایا ہے۔ پھر تم مجھ سے شکایت کرو گے کہ یار تمہاری بستی میں میرے ساتھ کیا بن گئی۔ الغرض ہم نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا جب میں رات کو اپنے بستر پر لیٹا میری آنکھوں کے سامنے شہزادی جمیلہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگئی۔ میری آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی۔ میں پہلے اس کیفیت سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول کر دریا ستلج کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ دریائے ستلج بپھرا ہوا تھا۔ دریا شور کے ساتھ کناروں کے ساتھ سر پٹک رہا تھا۔ مجھے اپنے اندر بھی اسی طرح کا شور محسوس ہوا۔ میں بڑی شدت سے صبح کا انتظار کرنے لگا کہ جلد ہی صبح ہو اور میں پیاری جمیلہ کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کے طوفان کو کچھ کم کرسکوں۔ صبح ہوتے ہی میں سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ کچی سڑک کے کنارے شہزادی جمیلہ اور اُس کا بھائی حامد نواز کپاس کو چوکی دے رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد میں حامد سے باتیں کرنے لگا۔ شہزادی جمیلہ مکھن ملائی سے بنی ہوئی۔ قدرت کی حسین ترین عورت کو محنت کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ میں نے کہا حامد کپاس پر تو بڑی سخت جان ماری کرنی پڑتی ہے۔ ان لہلہاتے سرسبز کھیتوں میں کپاس کی چاندی لگتی ہوگی۔ پیسے تو خوب ملتے ہوں گے۔ حامد دل میں غبار و کرب لیے ہوئے تھا۔ پھٹ پڑا۔ حامد نے کہا سائیں اچھی آمدنوں کا اندازہ آپ ہماری کمزور صحتوں، پیلے چہروں، ہمارے پیوند کے خستہ کپڑوں اور ٹوٹے پھوٹے چھپر نما گھروں کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ سائیں ہمارے اکثر نوجوانوں کو اتنی کم مقدار میں خوراک میسر آتی ہے کہ ان کے ناتواں جسموں میں تو صرف سانس ٹوکتی ہے۔ وہ تو چلتی پھرتی لاشیں بن چکے ہیں۔ زندگی کے طویل ترین تھکا دینے والے سفر کو ہم صرف سخت ترین محنت کے ذریعے مکمل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے پھول جیسے پیارے بچوں، بوڑھوں اور بیمار عورتوں کو بھی کام پر لگانا پڑتا ہے۔ تب بڑی مشکل سے یہ زندگی کی گاڑی گھسٹتی ہے۔

جعلی پیسٹی سائیڈ اور جعلی کھادوں کے ذریعے سودخوروں نے بھی ہمیں اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ ہمارے مال مویشی اور زرعی آلات کے ساتھ ساتھ ہماری زمینیں بھی اونی پونی قیمتوں پر فروخت ہونے لگی ہیں۔ جب ہر جگہ چھوٹ ہی چھوٹ ہے تو اس ملک کی ترقی کس طرح ہوگی۔ نہ جانے حامد اور کیا کچھ کہتا رہا۔ میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ میری نظروں کا مرکز تو حسین جمیلہ ہی تھی۔ پنل کمال مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا۔ مجھے لے کر ساتھ چلا گیا۔

میں نے کہا یار پنل اب تو زندگی میں قرار ختم ہوگیا ہے۔ سیر و تفریح میں دل نہیں لگتا۔ ہر وقت شہزادی جمیلہ کا خیال رہتا ہے۔ ہر وقت شہزادی

جمیلہ کی گزرگاہ پر اس اُمید پر کھڑا رہتا ہوں کہ شہزادی جمیلہ جب اس رستے سے گزرے گی تو میں اس پر ایک نظر تو ڈال لوں گا۔ جمیلہ کے بھائی حامد، پنل کمال اور بستی کے نوجوانوں نے بستی کے باہر کبوتروں کے ڈربے رکھے ہوئے تھے جمعہ کو کبوتروں کا میچ ہو رہا تھا لوگ کبوتروں کے میچ کو دیکھنے کے لیے بہت دور دور سے آیا کرتے تھے۔ بچے بوڑھے جوان بڑے جوش میں ہوا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ شراب کے نشے میں دھت ہوتے تھے۔ کبوتر بازوں کی سیٹیوں اور ہاہا کی وجہ سے کان پڑی آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں۔ شراب بستی محبت پور میں عام بنا کرتی تھی۔ اگر کبھی پولیس شراب کی بھٹیوں پر چھاپہ مار دیتی تو بستی والے لوگ شراب بنانے کے سامان چھپانے کے لیے شراب بنانے والوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ محبت پور کی اکثر عورتیں بھی چوری چھپے شراب پیا کرتی تھیں۔ آج کچھ شراب خوروں نے کبوتروں کے میچ کے بعد اپاہج بے سہارا ضعیف جیون مائی کے گھر گھس کر شراب کے نشے میں دھما چوکڑی کرتے ہوئے جیون مائی کو مار دیا تھا اور دوسری شرابیوں کی پارٹی نے راستے میں ٹرالیوں پر جاتی بارات کو روک کر عورتوں کو اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔

اس دنگا فساد میں بہت سے لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا میں کسی اور دنیا میں پہنچ چکا ہوں۔ یہاں کے سردار بااثر تھے وہ اپنی بستی والوں کے ووٹوں کے لالچ میں جرائم کی پشت پناہی کرتے تھے۔ ڈکیتی اور چوری کے متاثرہ لوگوں کو تھانے تک ہی نہ جانے دیتے تھے۔ اگر کوئی کیس تھانہ تک پہنچ بھی جاتا تو اپنے اثر سے ختم کرا دیتے تھے۔ ایک دن شہزادی جمیلہ خیرات کے پکے ہوئے چاول تقسیم کر رہی تھی۔ میرے گھر بھی آئی چاول کی پلیٹ مجھے دے کر کہنے لگی بابو آپ ہم جاہل لوگوں میں آ کر خوش بھی ہیں یا نہیں۔ میں نے کہا مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں یہاں آ کر خوش ہوں یا نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں تیرے قریب آ کر واپس جانا نہیں چاہتا۔ اگر میں اپنے بزرگوں کو تمہارے بزرگوں کے پاس بھیجوں تو کیا تم میرے ساتھ خوش رہ سکو گی؟

جمیلہ نے کہا ایسے خواب دیکھنے کا کیا فائدہ جو کبھی بھی پورے ہو ہی نہیں سکتے۔ مجھے انجام سے بہت خوف آتا ہے۔

بابو ایسے خواب نہ دیکھا کر جو ہم دونوں کے لیے تباہی لے کر آئیں۔ میرے بزرگ اپنوں سے باہر کسی صورت میں بھی میری شادی نہیں کریں گے۔

اب دوبارہ بھول کر بھی محبت اور شادی کا نام نہ لینا۔ ورنہ ہمارے دونوں کے لیے وہ تباہی آئے گی کہ دنیا عبرت پکڑے گی۔

جمیلہ کے منع کرنے کے باوجود بھی بڑی مشکل سے میں اپنے بزرگوں کو تیار کر کے جمیلہ کا رشتہ مانگنے کے لیے جمیلہ کے گھر بھیجا لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔

بزرگوں نے مجھے کہا کہ جمیلہ کو بھول جاؤ۔ وہ کبھی بھی، کسی صورت میں بھی تمہاری نہیں ہوسکتی۔ ایسے مشکل وقت میں میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ میں موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگا۔ خودکشی کے آسان طریقے ڈھونڈنے لگا۔ تو ایک پنل کمال ہی تھا جس نے میری دل جوئی کی۔ اس نے کہا ایک طریقہ ہے جس سے شہزادی جمیلہ تمہاری ہوسکتی ہے۔ پنل کمال مجھے لے کر بستی بہلی کے سائیں کالے جھبیل کے پاس پہنچا۔

سائیں کالا شیشم کے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہا تھا۔ سائیں اکیلا تھا۔ کچھ دیر بعد سائیں نے آنکھیں کھولیں اور مجھ سے کہا جا اس عورت کی قمیص لا۔ جسے تو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ کل تک یہ ہو جانا چاہیے۔ اچھا وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے جا بھاگ جا۔ جا بھاگ جا۔

پنل کمال مجھے کھینچتا ہوا کالے سائیں کے آستانے سے باہر لے آیا۔ پنل کمال نے کہا یار تیرا کام تو اب بن چکا ہے۔ اب شہزادی جمیلہ کی قمیص لانے کی فکر کرتے ہیں۔ پنل کمال نے مجھ سے ایک ہزار روپیہ لے کر جندن مائی کو دیا جس نے شہزادی جمیلہ کی قمیص چوری کر کے لانے کی یقین دہانی کرا دی۔

دوسری صبح شہزادی جمیلہ کی قمیص ہمارے پاس تھی۔ میں نے دس ہزار روپیہ اور قمیص سائیں کالے کے حوالے کر دی۔ سائیں کالا کچھ پڑھنے لگا اور ساتھ تھوڑی تھوڑی جمیلہ کی لان کی قمیص پھاڑ کر اپنے سامنے جلتی آگ میں ڈالنے لگا۔ جب نصف قمیص جل چکی تو اُس نے پڑھنا بند کر دیا۔ سائیں کالے نے گردن گھما کر اپنی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا۔

بچے اب تمہیں محنت کرنا پڑے گی۔ ڈرنا نہیں، حوصلے سے کام لینا ہے۔ باقی کام میں خود سنبھال لوں گا، تم نے محبت پور بستی والے مکان میں

کمرہ بند ہو کر باتی کی قمیض اس طرح جلائی ہے جس طرح میں نے جلائی ہے اور سائیں کالے نے ایک ورد بتایا یہی ورد میں نے تنہا جنگل میں بھی پڑھنا تھا۔ جب تک مجھے واپس گھر جانے کے لیے نہ کہا جائے۔

میں نے ایک کولر پانی بھنے ہوئے چنے لے کر سکھوں والی پتی کی طرف نکل گیا۔ یہ ریتلا بے آب و گیاہ علاقہ تھا دن کو بھی کوئی ذی روح بڑی مشکل سے گزرتا تھا۔ ایک بڑا سا پتھر یہاں پڑا ہوا تھا میں نے اُس کے ساتھ ٹیک لگالی۔ شہزادی جمیلہ کا تصور کرتے ہوئے میں ورد کرنے لگا پہلے پہلے مجھے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ پھر میں ورد میں اتنا مست ہو گیا کہ مجھے گرمی سردی اور کھانے پینے شب و روز کی بھی پروانہ رہی۔ میں ورد میں مست سے مست ہوتا گیا۔ ٹھیک تین روز کے بعد مجھے کسی نے کالر سے پکڑ کر اُٹھا دیا کہ تمہارا کام ہو گیا ہے جاؤ بھاگ جاؤ۔ جب میں بستی کے قریب پہنچا تو شہزادی جمیلہ نے محبت پور میں فساد برپا کر رکھا تھا کہ میں صرف بابو کی ہوں۔ میں نے بابو کے پاس جانا ہے۔ شہزادی جمیلہ کے رشتے دار گھسیٹ گھسیٹا کر گھر لے گئے۔ جمیلہ کو کمرے میں تالہ بند کر دیا گیا۔ کہا جانے لگا کہ جمیلہ کا منہ اور نظریں ہمیشہ میرے مکان کی جانب ہوتیں۔ اس وجہ سے جمیلہ کی گردن ٹیڑھی ہو گئی۔ اس افراتفری نے شہزادی جمیلہ کی صحت بڑی تیزی سے گرنے لگی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جمیلہ کا بھائی حامد میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تمہاری خواہش کے مطابق ہم تمہاری شادی جمیلہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے حامد سے دس دن کی مہلت لی کہ اس عرصے میں بزرگوں، دوستوں کو لے کر آتا ہوں۔ جب میں بہاول پور جانے لگا تو جمیلہ کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی۔ جمیلہ میرے پاس کھڑی تھی اور اس کے احمریں لب تھرتھرا رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی بابو تمہارے بغیر میں دس دن تک زندہ نہ رہ سکوں گی۔ اگر میں مرگئی تو مجھے بدر شاہ قبرستان خیر پور نامے والی میں دفن کیا جائے گا۔ وہی ہمارا قبرستان ہے وہاں بھی میری آنکھیں بڑی شدت سے تیرا انتظار کرتی رہیں گی۔ مجھ سے وعدہ کرو اگر میں مرگئی تو تم تا زندگی میری قبر پر آ کر فاتحہ خوانی کرتے رہو گے۔ میں نے کہا جمیلہ ہماری شادی ہو رہی ہے اس وقت میں دل ہلا دینے والی باتیں نہ کرو۔ ہم دونوں انشاء اللہ زندہ رہیں گے ہمارے بچے ہوں گے۔ کچھ آدمیوں نے جمیلہ کو پکڑ لیا اور واپس لے گئے۔ تقریباً چھ روز کے بعد پنل کمال میرے پاس بہاول پور آیا اس نے کہا بابو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچا جیسا کہ تم جانتے ہو کہ شہزادی جمیلہ صحت بڑی تیزی سے گر رہی تھی۔ جمیلہ کی بزرگ خواتین جمیلہ کو لے کر حکیم شفیق کے پاس علاج کے لیے پہنچیں۔ کسی زمانہ میں حکیم شفیق نے جمیلہ کا رشتہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ اس کا حکیم شفیق کو رنج تھا۔ حکیم شفیق نے بزرگ عورتوں سے جمیلہ کے مرض کے متعلق ساری حقیقت سنی۔

ساری حقیقت سن کر حکیم شفیق نے کہا جمیلہ کے دماغ کے بجائے پیٹ میں زیادہ خرابی ہے۔ جمیلہ کے پیٹ کا ایکسرے کرنا پڑے گا۔ میرے پاس کی دائی عورت ہے جو ایکسرے کی بڑی ماہر ہے لیکن ایکسرے کے وقت مریضہ کے کپڑے اُتارنے ضروری ہیں۔ مریضہ نے اعتراض کیا کہ میں کپڑے نہیں اُتاروں گی لیکن بوڑھی عورتوں نے کہا علاج میں شرم کیسی۔ ایکسرے کے بہانے پلورائیڈ کیمرے سے دائی نے شہزادی جمیلہ کے عریاں فوٹو بنا لیے۔ دو دنوں کے بعد شہزادی جمیلہ کے عریاں فوٹو کی بے شمار کاپیاں رات کو کوئی محبت پور کی گلیوں میں بکھیر گیا تھا۔ حامد باہر آیا اُس نے ہر طرف جمیلہ کے فوٹو بکھرے ہوئے دیکھے۔ حامد بے عزتی کو برداشت نہ کر سکا۔ ٹوکا لے کر جمیلہ کی طرف بھاگا۔ لوگ جمیلہ کی چھوٹی دیوار سے جمیلہ کے گھر میں جھانکنے لگے۔ ٹوکے کا پہلا وار حامد نے جمیلہ کے منہ پر کیا۔ جمیلہ کا نیچے والا ہونٹ کٹ کر لٹکنے لگا۔ ٹوکے کے دوسرے وار کو جمیلہ نے دائیں ہاتھ پر روکا۔ جمیلہ کا ہاتھ کٹ کر دور جا گرا۔ جمیلہ کی دلدوز چیخوں سے پوری بستی گونجنے لگی۔ جمیلہ دوڑ کر دروازے کی طرف جانے لگی تو حامد نے وار کر کے جمیلہ کی ٹانگوں کو کاٹ دیا۔ بستی کے لوگوں میں سے کسی نے بھی جمیلہ کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ تمہاری جمیلہ کے ٹکڑے ہوتے رہے۔ بستی کے لوگ تماشا دیکھتے رہے۔ آخری وار جمیلہ کی گردن پر ہوا۔ جمیلہ کا سر کٹ کر دور جا گرا۔ حامد ٹوکہ لے کر حکیم شفیق کی ہسپتال کی طرف بھاگا لیکن حکیم شفیق ہسپتال چھوڑ کر کہیں اور بھاگ چکا تھا۔ مجھ پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ دو سال تک بیمار رہا۔ خیر پور بدر شاہ قبرستان پر جمیلہ کی قبر پر کتبہ بنایا تو کچھ قرار ملا۔ اب قبر کی صفائی اور قبر کے اردگرد پانی چھڑکنے کا کام کرتا ہوں۔ قبر پر قرآن خوانی کرتا رہتا ہوں۔

فاحشہ

فیاض ملک/اسپین، بارسلونا

سات سال بعد دوبارہ وہاں جانا ہوا۔ اندرون شہر کے تنگ و تاریک کوچے، وہ بوڑھے خستہ حال مکان، سرخ پرانی اینٹوں سے بنی دیواریں، وہ بے ترتیبی سے لگے لکڑی کے پرانے کھمبے اور ان پہ آڑھی ترچھی آپس میں الجھی ہوئی بجلی کی تاریں، ہر شے ویسی کی ویسی تھی مگر ہر شے چمکتی چہکتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگا کہ در و دیوار اتنے سال بعد مجھے دیکھ کر ایسے ہی خوش تھے جیسے میں انہیں دیکھ کر خوش ہوں۔

ناصر کے دفتر پہنچا تو وہ خوشی سے کھل اُٹھا گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ دونوں بیٹھ کر حال احوال سننے سنانے لگے تو ناصر بولا کہ دس منٹ میرے ساتھ چل دو ٹرک نکلوا دوں پھر ہم دونوں میں ہے آج کا سارا وقت۔ خوش ہو کے کہا چل چل اسی بہانے ذرا مزدوروں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ سب ٹھیک ہیں۔ میں نے سرسری انداز سے ناصر سے پوچھا۔

اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے لاپرواہی سے بتایا ہاں ہاں سب ادھر ہی ہیں اور ٹھیک ٹھاک ہیں۔ دفتر سے نکل کر صحن سے ہوتے ہوئے بڑے سے گودام کی بوسیدہ عمارت کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جب ہم دونوں گودام کے بڑی سڑک کو نکلنے والے خارجی رستے کی طرف آئے تو وہاں مزدور دو ٹرکوں پہ سامان لاد رہے تھے۔ پہلے تو ناصر کو آتا دیکھ کر سب چوکنے ہوئے۔ مگر مجھے پہچان کر کام چھوڑ کر سب ہماری طرف لپکے۔

افلاس زدہ چہرے، دھوپ و دھول سے جلے اٹے بدن۔ پسینوں میں شرابور بوسیدہ لباس، تنگ دستی و زبوں حالی کی تصاویر بنے ان چہروں پہ اپنائیت و خلوص کی ایسی رونق آئی کہ ہر شے کھل اُٹھی۔ سب سے فرداً فرداً ملا۔ حال احوال پوچھا۔ گپیں مارتے ہوئے سب کام کاج بھول چکے تھے۔ کسی نے دیوار سے ٹیک لگا لی تو کوئی بوریوں پہ چڑھ بیٹھا۔ کچھ نے سگریٹ سلگائے تو سستے تمباکو کی بو نے گودام کی اپنی سیلن زدہ بو پہ غلبہ پا لیا۔ وہ کش لگاتے قہقہے مارتے ایک دوسرے کو چھیڑتے ان گزرتے سالوں کی باتیں سنا رہے تھے کہ ناصر نے تالی بجا کر متوجہ کیا اور تجویز دی کہ ابھی سارے کام میں جت جاؤ اور کام ختم کر کے دفتر آ جانا سب کو چائے مٹھائی کی دعوت اور جی بھر کے باتیں بھی کر لینا۔ سبھی خوشی خوشی اٹھ کھڑے ہوئے تو میں نے رجسٹر میں کچھ لکھنے میں مصروف ناصر سے پوچھا یار اپنا چاچا رمضان نظر نہیں آیا؟

حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے بتایا کہ وہ سامنے چاچا رمضان ہی ہے ناں جو سب سے آخر میں تجھے ملا تھا۔

اتنا کمزور اور پھیکا رنگ کیسا پڑ گیا ہے کہ پہچانا ہی نہیں جاتا۔ ان سات سالوں میں لگتا ہے اس کی زندگی کے پچیس سال گزر گئے ہوں۔ میں بڑبڑایا

ایسا ہی ہوتا ہے بھائی مزدور داری میں!

ناصر نے رجسٹر سے نظر ہٹائے بغیر جواب دیا۔

یہ نشہ تو نہیں کرنے لگ گیا۔ میں نے شک کرتے ہوئے ناصر سے سوال کیا۔

او بھولے بادشاہ نشہ کہاں سے کرے گا اتنی آمدن ہی نہیں بیچارے کی۔ اس نے بدستور رجسٹر پہ کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

بیمار پڑ گیا تھا کیا؟ میں نے پھر سے سوال کیا۔ او یار غربت سے بڑی کوئی بیماری نہیں۔ ناصر نے لکھتے لکھتے قدرے اکتاہٹ سے کہا۔

پر وہ لال دین اس سے دو سال بڑا ہے یہ زمان اور چشتی بھی اس کے ہم عمر ہیں غربت تو ان پہ بھی ہے اس بیچارے کی تو حالت ہی خراب ہو چکی ہے۔ میں نے افسردگی سے جواب دیا۔ ناصر نے لکھنا چھوڑ کر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

یار ان تینوں کے ہاں رمضان چاچا کی طرح پانچ پانچ جوان بیٹیاں نہیں ہیں ناں، کنواری بیٹھی ہوئی، جہیز نہ ہونے کے وجہ سے، شاید اس لیے!!

شہر کے مرکزی بازار میں واقع الحاج کریانہ ہول سیل شاپ کے بیرونی حصے میں کافی گہما گہمی تھی۔ چار لوگ مستعدی سے مول تول اور وصولی وغیرہ میں جتے ہوئے تھے۔ جبکہ دکان کے قدرے وسطی حصے میں گہرے رنگ کے میلے لباس میں ملبوس دو نوعمر لڑکے سرگرشیوں میں باتیں کرتے ہوئے خاکی لفافوں میں چائے کی پتی ڈال کر

نفاست بند کر کے اوپر دکان کے اسٹکر چسپاں کر رہے تھے۔ دکان کی پچھلے حصے کی طرف آہٹ سن کر دونوں نے چپ سادھ لی اور تیز تیز ہاتھ چلانے لگے۔ دکان کے پچھلے حصے میں موجود گودام کو جانے والا چھوٹا سا دروازہ کھلا۔ حاجی صاحب پسینے میں شرابور تھکن زدہ چہرہ لیے دکان میں داخل ہوئے، کن انکھیوں سے ملازمین کو دیکھا اور کاؤنٹر کے پیچھے پڑی بڑی سی آرام کرسی پہ نیم دراز ہو گئے۔ ایئر کنڈیشنر سے پھوٹتی خنکی نے راحت دی تو لیٹے لیٹے آنکھیں موند لیں۔ بازار سے گزرتی موٹر گاڑیوں کی آوازوں اور مختلف دکانوں پہ بجنے والی مختلف قسم کی موسیقی سے ایک عجیب بے ہنگم سا شور برپا تھا کہ اچانک بازار کی جامع مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ظہر کی اذان کی آواز نکلی۔ اذان سنتے ہی سارے ٹیپ ریکارڈز نے خوفزدہ ہو کر چپ سادھ لی۔

ایسی عورتوں کی اپنی تو کوئی عزت ہوتی نہیں دس کلو کے آٹے کے تھیلے کی خاطر مجھے بھی گناہ میں مبتلا کر گئی۔ فاحشہ، بے حیا کہیں کی۔

اذان سن کر حاجی صاحب نے قدرے ناگواری سے سوچا اور اٹھ کر غسل کرنے چلے گئے۔

قطعہ

سرفروشوں کے لیے جور و جفا کچھ بھی نہیں
بن محبت کیسے جینے کا مزہ کچھ بھی نہیں
زندگی جس کی تمنا میں مرے جاتے ہو
ایک کمزور سی ہچکی کے سوا کچھ بھی نہیں

نعت

دل میں بسی ہے جب سے محبت حضورؐ کی
ہر لمحہ لگ رہا ہے عنایت حضورؐ کی

اے عشرتِ زمانہ مجھے تجھ سے کیا غرض
میری نگاہ میں ہے قناعت حضورؐ کی

حسرت سے تک رہا ہے مدینے کو آج تک
جب سے فلک نے دیکھی ہے رفعت حضورؐ کی

دشمن کو بھی عطا کی محبت کی چاندنی
رحمت نہیں تو کیا ہے حکومت حضورؐ کی

میں بھی شمار ہوتا بلالؓ و صہیبؓ میں
ہوتی اگر نصیب میں خدمت حضورؐ کی

میں کیا کروں گا لے کے زمانے کی نعمتیں
مولا! مجھے عطا ہو شفاعت حضورؐ کی

کوئی مرے نبی سا نہ آیا، نہ آئے گا
حرفِ تمام ہو گئی سیرت حضورؐ کی

دنیا کی آرزو ہے نہ عقبیٰ کی ہے طلب
خوش ہوں کہ لکھ رہا ہوں میں مدحت حضورؐ کی

ڈاکٹر ایوب ندیم/ لاہور

غزل

بہت بھونچال لاتی ہے بڑی خوں ریز ہوتی ہے
تمہارا نام لوں تو دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے

کسی کی یاد راتوں کو مجھے سونے نہیں دیتی
مرا کاغذ قلم ہوتا ہے میری میز ہوتی ہے

تمہیں کیسے بتاؤں زندگی کیسے گزرتی ہے
ہمہ دم آنکھ اشکوں سے مری لبریز ہوتی ہے

تعفن پھیلتا ہے زندگی میں جب بھی دنیا کا
تری یادوں کی خوشبو سے نشاط انگیز ہوتی ہے

غموں کی راکھ پڑتی ہے جگر کا خون دیتے ہیں
زمیں شعر و سخن کی تب کہیں زرخیز ہوتی ہے

محبت دار پر کھینچے محبت کھال کھنچوائے
کبھی منصور ہوتی ہے کبھی تبریز ہوتی ہے

نیازتؔ چاہتا ہوں جس کو اس سے کم ہی ملتا ہوں
محبت فاصلے سے ہو تو پھر مہمیز ہوتی ہے

نیازت علی نیاز/ مانسہرہ

تصویر سا کیوں بنا ہوا ہے
اے شہرِ نگار، کیا ہوا ہے
مڑ مڑ کے بہار دیکھتی ہے
اک پھول ابھی کھلا ہوا ہے
میں زخم چھپا چھپا کے رکھوں
یہ پھول ترا دیا ہوا ہے
چپکی ہیں جو خواہشوں کی چڑیاں
پھر دل کا شجر ہرا ہوا ہے
اُس ظلم کے دیوتا کو دیکھو
دیوار میں خود چنا ہوا ہے
ہاتھوں پہ چراغ جل رہے ہیں
دیوار پہ دل دھرا ہوا ہے

وہ پوچھتے ہیں، تم کو یہ کیا چپ سی لگ گئی
کہتا ہوں میں کہ ہاں یہ ذرا چپ سی لگ گئی
ہنستا تھا اور چھنکتا تھا میں بات بات پر
دل میں چھناکا ایسا ہوا چپ سی لگ گئی
اس بار تو زلیخا تھی بازارِ مصر میں
سچ بولتا ہوں میں، بخدا چپ سی لگ گئی
دیوار و در کو، نوکروں کو خادماؤں کو
بولی جو مجھ سے مہر النسا، چپ سی لگ گئی
کچھ پرسخن مکاں تھے حویلی کے آس پاس
جوں ہی مرا دریچہ کھلا چپ سی لگ گئی
مجھ پر گمان کرتے ہیں وہ اپنی بزم میں
کونے میں جیسے آ کے ہوا، چپ سی لگ گئی
میں سوچتا تھا حُسن سے حُسن گمان تک
جیسے ہی مجھ پہ راز کھلا، چپ سی لگ گئی

بہت بکھر کے بھی یکجا پڑا ہوا ہے کوئی
سراب کب ہے، یہ چہرہ پڑا ہوا ہے کوئی
ترا جہان مکمل ہوا تو کیسے ہوا
ترے بغیر ادھورا پڑا ہوا ہے کوئی
نہ جانے دل ہے، کوئی خواب ہے، کہ رشتہ غم
تمہارے کمرے میں ٹوٹا پڑا ہوا ہے کوئی
اب اس کو لے کے بھی جانا پڑے گا منزل تک
ہمارے پاؤں پہ رستہ پڑا ہوا ہے کوئی
مٹا ہے فرق، معشیت کا اور مشقت کا
جہاں تھی ماں وہاں چرخہ پڑا ہوا ہے کوئی
جہاں تھا باپ، وہاں اُس کی ٹوٹی کرسی ہے
ہمارے گھر میں بھی رُتبہ پڑا ہوا ہے کوئی
تمہیں یہ شہر، مکمل دکھائی کیا دے گا
تمہاری آنکھ میں تنکا پڑا ہوا ہے کوئی

خواب کی اچھی سی تعبیر بھی ہو سکتی تھی
گھر جو اپنا تھا تو تعمیر بھی ہو سکتی تھی
ابرِ باراں کے نہ آنے پہ بہائے آنسو
آگ سے بچنے کی تدبیر بھی ہو سکتی تھی
تو نے باندھے ہیں جہاں پیار کے کچے رشتے
اُس جگہ پیار کی زنجیر بھی ہو سکتی تھی
میں نے اک حرفِ تدارک تھا ملایا اُس میں
زہر میں زہر کی تاثیر بھی ہو سکتی تھی
میں نے چپ رہ کے مسائل کو سمیٹا ورنہ
بحث ہو سکتی تھی، تقریر بھی ہو سکتی تھی
مجھ کو بھی میری خطاؤں پہ نوازا جاتا
تیرے جیسی مری تقدیر بھی ہو سکتی تھی

عجیب کرب، غلو نوبت شکست میں ہے
یہ میرا شہر ابھی حالت شکست میں ہے
کوئی اُٹھاتا ہے زخمی، کوئی چھپاتا ہے زخم
عجیب رشتہ ہے جو نسبت شکست میں ہے
چھپا ہوا ہوں کہ چھپنے کا مل گیا موقع
یقین فتح کا اس فرصتِ شکست میں ہے
اے شاہزادی اسیروں میں تو بھی ہے، افسوس
تری وفا کا گہر، دولت شکست میں ہے
میں تیرا آنکھوں کے کھاتا ہوں، ہار جاتا ہوں
عجیب لطف ہے جو عادتِ شکست میں ہے

یاد شہرِ گماں سے گزری ہے
ذہن و دل کے مکاں سے گزری ہے
آنکھ پر ریت کی لکیریں ہیں
موج دریا یہاں سے گزری ہے
اشک نے آنکھ میں بنائی لکیر
رہگذر، داستاں سے گزری ہے
رُخ پہ تیرے کرن اُجالے کی
روشنی، امتحاں سے گزری ہے
پانیوں میں ہیں تیرتے ہوئے خواب
آنکھ، آبِ رواں سے گزری ہے
تیری جانب تھا یوں دریچہ چشم
روشنی، جسم و جاں سے گزری ہے

ارشد نذیر ساحل/لاہور

تم مجھ کو سزا میری سنا کیوں نہیں دیتے
گر نقش غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

ہم نے دو پل بھی کبھی ساتھ گزارے کب تھے
اک گماں سا تھا فقط آپ ہمارے کب تھے
یہ تو، تو تھا کہ ہمیں تیرا بھرم رکھنا پڑا
ورنہ ہم لوگ کسی اور سے ہارے کب تھے
یہ بجا ہے کہ اِدھر آ کے نہ کچھ ہاتھ آیا
اُس طرف بھی مری قسمت میں ستارے کب تھے
تیرے آنے سے مناظر ہیں سبھی رنگ بھرے
تیرے بن آنکھ کو جچتے یہ نظارے کب تھے
یہ نصیبہ تو مرے گاؤں کے لوگوں ہی کا تھا
شہر میں تیرے بھلا ہجر کے مارے کب تھے
یہ تو چھلنی ہے مرا سینہ تری باتوں سے
تیر دشمن نے مرے دل میں اُتارے کب تھے
کتنے لوگوں سے تھا دن رات تعلق اپنا
ساتھ رہتے تھے مگر یار وہ سارے کب تھے
چارہ گر جس کو سمجھتے تھے ہمیں چھوڑ گیا
ساحل اس دل کو زمانے کے سہارے کب تھے

ساتھ رکھتا ہوں اپنے یار کی چیز
یہ اُداسی تو ہے ہزار کی چیز
پھر بھی دیتے ہیں تم کو نذرانہ
جانِ جاں! جان ہے اُدھار کی چیز
ہم تری یاد کو بھلا دیتے
یہ اگر ہوتی اختیار کی چیز
دل میں شک کی جگہ نہیں بنتی
ہے محبت تو اعتبار کی چیز
شمع سے پوچھ یا تو پارے سے
بے قراری ہے کیا قرار کی چیز

لالہ زاروں میں یہ کُھلا ساحل
بے کلی دل کی ہے بہار کی چیز

زندگی ہے یہاں مہرباں کتنے دن
سر پہ اپنے ہے یہ آسماں کتنے دن
سونا سونا رہے گا مگر کب تلک
تنہا تنہا رہے گا مکاں کتنے دن
لب پہ کب تک رہیں گی یہ خاموشیاں
ہم رہیں گے یونہی بے زباں کتنے دن
جانے کب تک رہے گلستاں میں بہار
اور آنگن میں ہے یہ خزاں کتنے دن
اس کی خوشبو تو رسوا کرے گی ضرور
یہ محبت رہے گی نہاں کتنے دن
یہ جو اب مجھ میں لیتے ہیں انگڑائیاں
یہ بھی جذبے رہیں گے جواں کتنے دن
جانے کب تک رہیں گے یہ ساحل یونہی
ہے سمندر کی ان کو اماں کتنے دن

تم مجھ کو سزا میری سنا کیوں نہیں دیتے
گر نقش غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے
لوٹ آنے کے اُٹھتے ہیں بگولے مرے اندر
اک بار مجھے آپ صدا کیوں نہیں دیتے
اُجڑے در و دیوار دکھاتے ہو ہمیشہ
تم بات مجھے سیدھی بتا کیوں نہیں دیتے
چُپ چاپ تمہیں دیکھتے رہنا ہے مرا جرم
محفل سے مجھے اپنی اُٹھا کیوں نہیں دیتے
معلوم زمانے کے مسائل تو ہیں ان کو
یہ لوگ محبت کی دُعا کیوں نہیں دیتے

لہروں سے گلے مل کے بھی رہتا ہے وہ پیاسا
ساحل کو سمندر سے ملا کیوں نہیں دیتے

ہم دل کا حال اُن کو سنائیں براہِ راست
اب اُن سے میل جول بڑھائیں براہِ راست
یہ درمیاں کے لوگ بڑھائیں گے تلخیاں
شکوے گلے ہیں جتنے مٹائیں براہِ راست
چاند اور جھیل جس طرح ملتے ہیں رات کو
اک دوسرے کے پاس یوں آئیں براہِ راست
لہروں کی طرح آج وہ آئے ہیں میری سمت
ساحل ہم اپنی پیاس بجھائیں براہِ راست
ضامن کسی کو اور بنانے سے فائدہ
دُشمن سے ہاتھ اپنے ملائیں براہِ راست

وہم و اندیشے گماں پردیس میں
سولی پہ لٹکی ہے جاں پردیس میں
کس طرح کٹتے ہیں اپنے روز و شب
آ کے دیکھو تو یہاں پردیس میں
پھول کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں اور
ابر لگتے ہیں دھواں پردیس میں
دیکھتا ہوں تاروں میں احباب کو
یادوں کی ہے کہکشاں پردیس میں
گلستاں میں جی نہیں لگتا مرا
فصل گل بھی ہے خزاں پردیس میں
آشنا بنتی نہیں ساحل زمیں
اجنبی ہے آسماں پردیس میں

سعدیہ سیٹھی / برطانیہ

کوئی تو مجھ کو ڈھونڈنے آئے گا اس لیے
ہر موڑ پر گلاب گراتے ہوئے گئی

ہر طرف گہرا دھواں ہے اور میں
اک نیا پھر امتحاں ہے اور میں
چاند ہیں حد نظر تک آنکھ کے
آنسوؤں کی کہکشاں ہے اور میں
رسم دنیا کے تقاضے اور ہیں
کیا کروں کہ دل جواں ہے اور میں
لاکھ اندیشے کروڑوں وسوسے
جانے کیا سے کیا گماں ہے اور میں
آنچل اوڑھے چل رہی ہوں اس کے ساتھ
سر پہ بوڑھا آسماں ہے اور میں
موت ہی لگتی ہے اُمید بہار
زندگی بھر کی خزاں ہے اور میں
سامنا ہے پھر نئی اک جنگ کا
سعدیہ پھر خانداں ہے اور میں

اپنے رب سے اک خوشی کی التجا کرتے ہوئے
رو پڑی میں اپنے حق میں کل دعا کرتے ہوئے
سانحہ ایسا بھی ہوگا جانتی ہرگز نہ تھی
ہوگئی خود سے جدا اُس کو جدا کرتے ہوئے
بے وفائی کا انہیں الزام دینا ظلم ہے
عمر جن کی بیت جاتی ہے وفا کرتے ہوئے
دیکھتی ہوں اپنے گھر کے میں، در و دیوار کو
روز پنجرے کے پرندوں کو رہا کرتے ہوئے
ہو گیا خاموش ساز ہستی نغمے چھیڑ کر
ہو گئی خاموش آخر میں صدا کرتے ہوئے

اپنی مرضی کرتا ہے وہ جو بھی کرنا ہو اُسے
اہمیت دیتا ہے مجھ کو مشورہ کرتے ہوئے
سعدیہ اُس کا تو ہم سے حق ادا ہوتا نہیں
میں بھی مرجاؤں گی اک دن حق ادا کرتے ہوئے

کردار اپنا پورا نبھاتے ہوئے گئی
ہر سمت میں تو دیپ جلاتے ہوئے گئی
رستوں میں اور کون مرا درد بانٹتا
پیڑوں کو اپنا حال سناتے ہوئے گئی
کوئی تو مجھ کو ڈھونڈنے آئے گا اس لیے
ہر موڑ پر گلاب گراتے ہوئے گئی
ٹھوکر لگی تو اُس کا مجھے فائدہ ہوا
پتھر میں راستے سے ہٹاتے ہوئے گئی
مل مل کے اپنی آنکھیں اُنہیں دیکھتی رہی
میں سوئے منظروں کو جگاتے ہوئے گئی
رستے میں پڑتے تھے مرے احباب سعدیہ
رُوٹھے ہوؤں کو اپنے مناتے ہوئے گئی

زمانہ اچھا ہے، سارا زمانہ تو نہیں اچھا
یونہی رہ چلتوں کو اپنا بنانا تو نہیں اچھا
یہ دنیا ہے اسے تو چھوڑ جانا ہے ہمیں آخر
کسی صورت یہاں دل کو لگانا تو نہیں اچھا
بہت ہی بے وفا ہے یہ تو اک دن چھوڑ جائے گی
تعلق زندگی سے اب بڑھانا تو نہیں اچھا
گزر اوقات کرنا چاہیے اپنی ہی چادر میں
کسی کا اس طرح احساں اُٹھانا تو نہیں اچھا
ٹھہرنا ہے تو ٹھہرے جانا ہے تو وہ چلا جائے
کہ سادہ دل کی مشکل کو بڑھانا تو نہیں اچھا
ہوا سے کہہ دو آہستہ بجائے کھڑکیاں اور در
کہ گھر بیٹھے ہوؤں کو یوں ستانا تو نہیں اچھا
یہ ہم نے مانا ہو تم سعدیہ سیدھی بہت لیکن
یونہی دل کھول کر سب کو دکھانا تو نہیں اچھا

دعا کروں تو میں لوگوں کی خیر مانگتی ہوں
کہ سب کے بچوں بزرگوں کی خیر مانگتی ہوں
مرا وظیفہ ہمیشہ سلامتی سب کی
امیروں اور غریبوں کی خیر مانگتی ہوں
مرا سفر تو سہولت سے کٹتا جاتا ہے
جدھر سے گزروں میں رستوں کی خیر مانگتی ہوں
اُداس دیکھا نہیں جاتا کوئی بھی مجھ سے
میں سارے دکھ بھرے چہروں کی خیر مانگتی ہوں
جو خواب دیکھتے ہیں مجھ کو اچھے لگتے ہیں
ہمیشہ اُن کی میں آنکھوں کی خیر مانگتی ہوں
پہاڑ، دریا وطن کے سدا رہیں آباد
میں اس کے باغوں کے کھیتوں کی خیر مانگتی ہوں
جو ملک و قوم کو بیدار رکھتے ہیں ہر پل
میں سعدیہ انہی جذبوں کی خیر مانگتی ہوں

ظفر اعوان/ڈنمارک

تم مجھے دیکھتے نگاہوں سے مجھ پہ حیران بے بسی ہوتی

ظفر اعوان یکم جنوری 1982ء کو گاؤں ہر پال اعوان ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ماسٹر آف سائنس ان کمپیوٹر یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب، لاہور ماسٹر ان سائنس ان ٹیلی کمیونکیشن بلی کنگھے انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کارلسکرونا سویڈن سے ہیں۔ 2004ء میں ظفر اعوان کا اردو غزلیات پر مشتمل شعری مجموعہ آرزوئے سحر شائع ہو چکا ہے۔ اسی سال پنجابی شعری مجموعہ ''زیویں سدھراں دی'' شائع ہوا ہے۔ بسلسلہ روزگار آج کل کوپن ہیگن ڈنمارک میں مقیم ہیں۔ (ارژنگ)

تم سے مل کر مجھے خوشی ہوتی
تیرگی میں بھی روشنی ہوتی
تم مجھے دیکھتے نگاہوں سے
مجھ پہ حیران بے بسی ہوتی
ہم سمجھ جاتے جو کہانی ہے
ہم سے اک بات تو کہی ہوتی
راستے ساتھ ساتھ کٹ جاتے
منزلوں پر نہ یوں کمی ہوتی
تو جو ہوتا سخن شناس ظفؔر
تیرے لہجے میں چاشنی ہوتی

تری زلفوں کو سر کرتے
یہ مشکل تھا مگر کرتے
یہ خواہش تھی کبھی تو وہ
مری جانب نظر کرتے
ستارے توڑ لاتا میں
محبت تم اگر کرتے
تری گلیوں سے بچتے تو
سوئے منزل سفر کرتے
دلِ اعواؔن میں رہ کر
ان آنکھوں میں سفر کرتے

جو دیکھا اک نظر دیکھا
اُسے میں نے مگر دیکھا
سمندر کا سفر دیکھا
ہے دشمن بحر و بر دیکھا
ہے چہروں کی اُڑی رنگت
جو جذبہ بے اثر دیکھا
بھٹکتے ہیں یوں گلیوں میں
ہوئی مدت کہ گھر دیکھا
نہ کوئی ہم نوا پایا
نہ کوئی ہم سفر دیکھا
بجھی آنکھیں بجھا چہرہ
کبھی تو نے ظفؔر دیکھا

ترا غم جہاں نہ ہوا کرے
وہاں کہکشاں نہ ہوا کرے
مجھے دے دعا مرے عشق کی
ہے جو امتحاں نہ ہوا کرے
یہ بہار ہے مجھے چھیڑتی
کبھی یہ سماں نہ ہوا کرے
کس سوچ میں مری آنکھ سے
کبھی کچھ عیاں نہ ہوا کرے

اُسے جا کے کہہ دے تو اے صبا
کہ وہ بدگماں نہ ہوا کرے

میرے دل کو نہیں اب تری جستجو
مر چکی ہے مری بے تکی آرزو
سوچنا ہے مجھے اب نہیں روٹھنا
چھوڑنا ہے تجھے اب ترے روبرو
بن سکے نہ کبھی تم مرے ہم نوا
نفرتوں سے بھرے ہو مگر خوبرو
جیتنا ہے ابھی غربتوں سے مجھے
ہو گئیں دولتیں لازمی چار سُو
مفلسی میں کبھی نہ کسی کو ملی
مانگتا ہے خدا سے ظفؔر آبرو

ڈنمارک میں مقیم ممتاز شاعر ظفر اعوان
کے شعری مجموعے
''آرزوئے سحر''
کا دوسرا ایڈیشن طباعت کے آخری مراحل میں
اہتمام: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور،
0300-4489310

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

آسی کسی چراغ نے مجھ کو پکڑ لیا   میں آ رہا تھا چاند ستاروں کو ٹال کر

عدیل احمد آسی کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ مگر آج کل وہ بسلسلہ روزگار ڈنمارک میں مقیم ہیں۔ عدیل احمد آسی نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات، سرحد یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی سے ماسٹر آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ MIT میں امتیازی پوزیشنیں گورنر KPK سے گولڈ میڈل اور ایم ایس سی ٹیلی کمیونکیشن کی ڈگریاں بھی حاصل کر چکے ہیں۔ تین سال تک جرمنی کی یونیورسٹی براؤنس وک میں جاب کی۔ ڈنمارک میں تحریک کشمیر ڈنمارک کے صدر ہیں۔ پاکستان سوسائٹی ڈنمارک کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں۔ غزالی ایجوکیشن فورم ڈنمارک کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ ادبی و ثقافتی تنظیم بیلی کوپن ہیگن کے ثقافتی ونگ کے صدر ہیں۔ خوب صورت شاعر ہیں۔ ان کی چند غزلیں نذرِ قارئین۔ (ماہنامہ ارژنگ)

شکاری، باغباں میں تو سمجھ بیٹھا
قفس کو، آشیاں میں تو سمجھ بیٹھا
وہ جس کی شوخیوں کے قصے تھے مشہور
وہ چپ تھا، بے زباں میں تو سمجھ بیٹھا
در و دیوار سے جانے تھی کیا نسبت
کہ چھت کو آسماں میں تو سمجھ بیٹھا
جو ہر منظر کا پس منظر کھلا مجھ پر
یقیں کو بھی گماں میں تو سمجھ بیٹھا
وہ ذرہ بھی نہیں تھا ذات میں اپنی
جسے سارا جہاں میں تو سمجھ بیٹھا
جو دشمن آ رہے تھے مشعلیں لے کر
وہ منظر کہکشاں میں تو سمجھ بیٹھا
نظر نے اتنے دھوکے کھائے تھے آسی
کہ بادل کو دھواں میں تو سمجھ بیٹھا

تو رکھ قدم زمین پہ اپنا سنبھال کر
مخلوق اور بھی تو ہے اُس کا خیال کر
اوقات یاد رکھتا ہوں اپنی ہمیشہ دوستو
میں دیکھتا ہوں کپڑے پرانے نکال کر
ترکِ تعلقات میں عمریں گزر گئیں
دو چار روز باقی ہیں رشتہ بحال کر
میرا ترے علاوہ نہیں ہے کوئی یہاں
میرا خیال چھوڑ تو اپنا خیال کر
چپ رہنے سے بڑھیں گے مسائل یہ دیکھنا
بہتر ہے بات کر، کوئی اپنا سوال کر
وہ کام کر کہ تیری زمانہ مثال دے
روشن وطن کا نام ہو ایسا کمال کر
آسی کسی چراغ نے مجھ کو پکڑ لیا
میں آ رہا تھا چاند ستاروں کو ٹال کر

ذرا ٹھہرو منظر بدل جائے گا
ذرا ٹھہرو دل بھی سنبھل جائے گا
تپش سہہ رہا ہوں اسی آس پر
یہ سورج بھی اک روز ڈھل جائے گا
میں سینے میں دل جس قدر باندھ لوں
تمہیں دیکھتے ہی مچل جائے گا
نہ وہ نام لے لے کے چھیڑو یہ دل
وگرنہ یہ سب کچھ اُگل جائے گا
وہ جب شام کو آئے گا دیکھنا
دیا خودبخود کوئی جل جائے گا
ترے ساتھ کچھ بھی نہیں جائے گا
اگر جائے گا تو عمل جائے گا
چلو کھوٹا سکہ ہی آسی سہی
کبھی وقتِ مشکل یہ چل جائے گا

اجل محافظ ہے زندگی کی
یہی حقیقت ہے آگہی کی
ہے عاجزی میں خدا کی قربت
ہے شرح اتنی سی بندگی کی
شدید غفلت میں عمر گزری
ہے شرم ساری فقط اسی کی
کتاب پہلو میں اور بھٹکنا
ہے کیسی لغزش یہ آدمی کی
ان آنسوؤں سے دیے جلائے
جگر کے خوں سے ہی روشنی کی
خدا سے پوچھا خدا کے بارے
کمال ہم نے بھی سادگی کی
دکھا رہا ہوں میں زخم آسی
یہ لوگ کہتے ہیں شاعری کی

طاہر عدیل طاہر/ڈنمارک

یونہی بادباں اب نہیں کھولتے ہم — سمندر کی پہلی ہوا دیکھتے ہیں

طاہر عدیل طاہر کا آبائی شہر ساہی وال ہے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ کمپری ہنسیو ہائی اسکول ساہیوال سے حاصل کی۔ ایم ایس سی ٹیلی کیمونکیشن گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور اور ایم ایس سی الیکٹریکل انجینئرنگ بی ٹی ایچ سویڈن سے کی۔ کچھ عرصہ انگلینڈ میں سکونت پذیر رہے۔ آج کل ڈنمارک کوپن ہیگن میں مقیم ہیں۔ بہت عمدہ شاعر ہیں چند غزلیں نذر قارئین۔ (ماہنامہ ارژنگ)

آدمی سے وفا نہیں ملتی
حاسدوں سے دعا نہیں ملتی

جرم آنکھیں اگر کوئی نہ کریں
پھر تو دل کو سزا نہیں ملتی

جو ہو بیمار عشق کا اُس کو
زندگی بھر شفا نہیں ملتی

جن کو ٹھکرا دے خود مسیحا بھی
کوئی ان کو دوا نہیں ملتی

وہ جو گر جائے شخص نظروں سے
اُس کو دل میں جگہ نہیں ملتی

راضی رکھتا نہیں جو بندوں کو
اُس کو رب کی رضا نہیں ملتی

میری پرواز اُونچی کر مولا
مجھ کو تازہ ہوا نہیں ملتی

کچھ اندھیروں سے آشنائی رکھ
روشنی تو سدا نہیں ملتی

اُن سروں پر تو ہاتھ رکھ طاؔہر
جن سروں کو ردا نہیں ملتی

اس بات کا لوگوں پہ اثر کیوں نہیں ہوتا
ہر کوئی فرشتہ ہے بشر کیوں نہیں ہوتا

فرقت کا گزرتا ہی نہیں ہے کوئی لمحہ
قربت کا تری لمحہ امر کیوں نہیں ہوتا

سورج کی طرح دھوپ دیا کرتے ہیں سب لوگ
اس دھوپ میں ہر شخص شجر کیوں نہیں ہوتا

منزل پہ پہنچ کر بھی نہیں ملتی ہے منزل
اب ختم یہ جیون سے سفر کیوں نہیں ہوتا

ہو ہجر کا لمحہ یا محبت کا کوئی پل
ہر بار گزر جائے بسر کیوں نہیں ہوتا

کیوں شہر میں کانٹوں کے پڑاؤ میں ہمارے
اک بار بھی پھولوں کا نگر کیوں نہیں ہوتا

ہاں اُس سے کئی بار کیا ترکِ تعلق
ہر بار ہی ہوتا ہے مگر کیوں نہیں ہوتا

کیا میری محبت میں کمی ہے کوئی طاؔہر
جو حال اِدھر ہے وہ اُدھر کیوں نہیں ہوتا

تجھے دیکھتے ہیں خدا دیکھتے ہیں
یہی جلوے ہم جابجا دیکھتے ہیں

زمانے میں مت کر شمار اپنا ہرگز
زمانے سے تجھ کو جدا دیکھتے ہیں

یونہی بادباں اب نہیں کھولتے ہم
سمندر کی پہلے ہوا دیکھتے ہیں

خدا کا کرم ہے کہ دشمن ابھی تک
ہمیں تو اکٹھے کھڑا دیکھتے ہیں

ابھی تک اُمیدیں ہیں وابستہ اُس سے
دریچے میں جلتا دیا دیکھتے ہیں

وگرنہ زمانہ قدیمی پرانا
ترے ساتھ اس کو نیا دیکھتے ہیں

سزا انتقاماً سناتے ہیں طاؔہر
کہاں وہ ہماری خطا دیکھتے ہیں

حیات داؤ پہ اپنی لگا کے دیکھتے ہیں
کہ آج ہم بھی اسے آزما کے دیکھتے ہیں

چلو اُسے نظرانداز کر کے محفل میں
یہ جاں شکنجے میں اپنی پھنسا کے دیکھتے ہیں

محال اپنے مقدر سے لڑنا ہے لیکن
لکیریں ہاتھ کی ساری مٹا کے دیکھتے ہیں

ہماری آنکھ میں لگتے ہیں کس طرح آ کر
تمہاری آنکھ سے سپنے چرا کے دیکھتے ہیں

یہ لوگ دل نہیں سینے میں رکھتے ہیں پتھر
تو پتھروں میں کہیں گھر بنا کے دیکھتے ہیں

یہ عشق ہے میاں اس میں انا نہیں ہوتی
انا کے بت یہ سبھی ہم گرا کے دیکھتے ہیں

تمام عمر ملے ہیں جھکا کے نظریں جنہیں
ہم آج ان سے ہی نظریں ملا کے دیکھتے ہیں

یہاں پہ دشمن جاں ہم تو آپ ہیں اپنے
عدیؔل خود سے بھی دامن بچا کے دیکھتے ہیں

نئی دنیا کی چاہ میں

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب ہم لاہور ایئرپورٹ سے چلے تو موسم میں خنکی بہت تھی۔ میں نے اپنا پسندیدہ ڈبل بریسٹ کوٹ پتلون پہنا ہوا تھا۔ ابوظہبی ایئرپورٹ پر جو چالیس منٹ طیارہ کھڑا رہا وہ قیامت کے تھے۔ کیونکہ آدمی عام ہو یا صدر مملکت۔ ساری دنیا کے سامنے اپنی خارجہ پالیسی بدل سکتا ہے کپڑے نہیں۔ میں نے چار بار ایئر ہوسٹس جی ہاں اُسی ماسکو والی مجسمہ ٹائپ خاتون سے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا جو کہ وہ بھاگ کر لے ابھی آتی رہی۔ مگر طیارے کا اے سی بند ہونے کی وجہ سے میں پسینے میں نہا گیا۔ اُوپر سے ڈبل بریسٹ سوٹ اور نیچے ہائی نیک جرسی نے مجھے ہائی جیک کیا ہوا تھا۔

دوبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے سے پہلے طیارے نے پورے دوبئی کا ایک چکر لگایا۔ نیچے رنگ ہی رنگ روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ بعض مضافاتی علاقوں میں تو نیچے چلتی ہوئی گاڑیاں، ان کی روشنی اور سڑکوں پر لگے پول بھی نظر آ رہے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی عبدالقدوس اور ان کے شارجہ میں مقیم ہیں وہ اور ان کے دوست ہمیں ویلکم کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اب ہماری منزل یہاں سے ذرا دور ساحل سمندر پر موجود ایک خوبصورت قصبہ تھا جسے خورفکان کہتے ہیں۔ ذرا میں نے اس لیے کہا کہ 250 میل کا سفر وہاں بڑی جلدی گزر گیا۔ دوبئی ایئرپورٹ سے نکلے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ بھائی نے بتایا یہاں سے شارجہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا چلو یہ تو اچھا ہے نہ ویزا نہ پاسپورٹ خدا ان ریاستوں کو متحد رکھے بلکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ بنائے۔ (آمین ثم آمین)۔ دوبئی شہر میں آٹھ آٹھ لین کی ٹریفک آنے اور جانے کے لیے چل رہی تھی۔ بہت بڑے نیون سائن مجھے سڑکوں کے دونوں جانب نظر آ رہے تھے۔ بھائی کو گاڑی بھی ان کے میونسپلٹی آفس والوں نے دی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی ہم ہنگامہ ہائے شہر سے نکل کر مضافات میں آ چکے تھے۔ راستے میں بھابھی نے موبائل پہ پوچھا تو ہم نے اپنے لینڈ کر جانے کی نوید انہیں وہیں راستے میں سنا دی۔ راہ میں ایک اور خوبصورت شہر زید آیا جہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رُکے۔ مشروبات کا اک دور چلا، سڑک کنارے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے قہوہ خانے دراصل قہوہ کی بجائے کولڈ ڈرنکس اور آئس کریم کے علاوہ ایسی اشیا لے کے براجمان ہوتے ہیں جن کی مدد سے منہ چلایا جا سکے۔ تھوڑا آگے گئے تو ایک جگہ نمائش ٹائپ سائباں لگے ہوئے تھے جن میں کراکری کا سامان جابجا قرینے سے لگا ہوا تھا۔ بہت سے خوشنما سٹال موجود تھے۔ سڑک کے پاس انتہائی قیمتی گاڑیاں جن میں BMW اور ٹیوٹا کرولا کے Latest Model شامل تھے بے یارو مددگار کھڑی تھیں۔ پاس کوئی ذی روح نہ تھا۔ میری حیرانی پر بھائی نے بتایا کہ یہاں سڑک کے کنارے آپ گاڑی کھڑی کر جائیں دوکان کھلی چھوڑ جائیں چوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ قانون بہت سخت ہے اور لاگو بھی ہوتا ہے۔ سڑک کے دونوں اطراف میں بہت سی دوکانوں پر خوشنما بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر جلی حروف میں لکھا تھا ''کافتیریا'' جو یقیناً کیفے ٹیریا کا عربی ترجمہ تھا۔ اس وقت مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آئی جو کہا کرتے ہیں کہ دوبئی کی ہوشربا ترقی دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ شہر امریکہ کا عربی ترجمہ ہے۔ پھر مجھے اپنے دوست منیر مہنگا صاحب یاد آئے جو پچھلے چالیس سال سے انگلینڈ کے انڈسٹریل شہر مانچسٹر میں سیٹل ہیں۔ ان کے بچے یوکے کی سردی سے گھبرا کر دوبئی آ جاتے ہیں گرمی کو انجوائے کرنے۔ یہ سوچ آتے ہی میں نے اپنا کوٹ اُتار کر بھائی کو دیا تاکہ ابوظہبی کے پسینے میں نہائی ہوئی میری جرسی سوکھ کر ''نیو جرسی ہو سکے''

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ہم سے آگے سفر کرنے والی گاڑی پر سڑک کے کنارے سے ایک لشکارا سا پڑا۔ چشم زدن میں جیسے بجلی چمکتی ہے میں نے بھائی سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے تو پتہ چلا کہ ہم سے آگے جانے والی گاڑی اوور سپیڈ تھی۔ یہاں عموماً پولیس نہیں ہوتی بس ٹریفک پولیس والوں کا کیمرہ نصب ہوتا ہے جو خلاف ورزی کرنے والی گاڑی کے اگلے حصے کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ جب گاڑی کا مالک اپنا لائسنس Renew کروانے جاتا ہے تو کمپیوٹر بتاتا ہے کہ آپ نے اتنی بار ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کی۔ بس اس حساب سے درہم دے جائیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ مجھے خیال آیا کہ گوجرانوالہ میں کسی سڑک کے کنارے اگر

میں گاڑی کھڑی کر کے رات کو چلا جاؤں یا مندرجہ بالا سطور کے مطابق کراکری کا سٹال کھلا چھوڑ جاؤں تو تھوڑی دیر بعد نہ گاڑی ملے نہ کراکری اور میرا مزا ہو جائے گا کرکرا!

سڑک پر وقفے وقفے سے پول لگائے گئے تھے جن پر روشنی بکھیرنے والی بڑی لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک سڑک پر اندھیرا چھا گیا۔ اس اچانک افتاد سے بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے اندھیرے میں دور دور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی بیس کلومیٹر کا علاقہ دراصل متنازعہ ہے۔ قطر والوں کا موقف ہے کہ یہ علاقہ اُن کا ہے جب کہ شارجہ والوں کا خیال ہے کہ یہ علاقہ اُن کا ہے۔ اس لیے سڑک پر جو حکومت روشنی کا انتظام کرتی ہے دوسری حکومت کے گماشتے آ کر پول اُکھاڑ کر لے جاتے ہیں۔

اب رات کے تین بجنے والے تھے۔ تھوڑی دور بہت سی روشنیاں جگمگ کرتی نظر آ رہی تھیں۔ یہ ہماری منزل تھی۔ شارجہ کا خوبصورت ساحل اور اس پر موجود خورفکان ☆ کا خوش کن پہاڑی قصبہ اور اسی قصبہ کے ولا میں ہماری بھابھی اور بچے ہماری آمد کے منتظر تھے۔ بہت دور سے صرف اور صرف اپنے ملنے آئیں تو خوشی کیوں نہ ہو۔ ہمارے لیے انہوں نے انواع واقسام کے کھانے تیار کر رکھے تھے مگر میں نے انہیں بتایا کہ جہاز میں اچھا خاصا ڈنر کر کے آئے ہیں۔ بس ہم تو بڑی دور سے آئے ہیں پیار کا تحفہ لائے ہیں۔ آپ ہمیں کوئی پلنگ عنایت کریں جس پر لمبی تان کر سو جائیں۔

عبدالقدوس کی کوٹھی جسے وہ مقامی زبان میں ولا کہتے ہیں بہت کشادہ تھی کمروں میں تو قالین تھے ہی حتیٰ کہ صحن میں بھی قالین بچھے تھے۔ بیڈ رومز میں تو اے سی تھے ہی کچن میں بھی اے سی لگے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے جب گرمی انتہا کی ہو تو گھر میں دفتر میں گاڑی میں حتیٰ کہ پنکچر لگانے والی دوکان میں بھی اے سی لگا ہوتا ہے۔ مگر وہاں پنکچر لگواتا ہی کوئی کوئی ہے یا شاید کوئی بھی اس نیک کام کو سرانجام نہ دیتا ہو۔ کیونکہ وہ ایک دولت مند قوم ہے۔ پنکچر شدہ ٹائر/ تار پھینکتی ہے نیا لگوا لیتی ہے۔ اس ساحلی قصبہ کی گلیاں بہت کشادہ ہیں۔ گلیاں کہاں سڑکیں ہی کہیں۔ گرمی کے باوجود سہ پہر کے بعد بعض عمر رسیدہ خواتین گھروں کے سامنے قالین ڈال کر گپ شپ کے موڈ میں بیٹھ جاتی ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں بند گلیوں میں عورتیں پیڑھی پر بیٹھ کر سبزیاں بناتی ہیں۔

شام کے وقت ہم بھی ساحل سمندر پر گئے۔ جو ہمارے گھر سے صرف اور صرف ایک فرلانگ دور تھا۔ ساحل کے گرد بڑے خوبصورت فٹ پاتھ اور چلڈرن پارک بنائے گئے ہیں۔ سمندر کی موجیں دور سے چیختی ہوئی آتی ہیں اور اس فٹ پاتھ سے کچھ دور آ کر ہولے ہولے ریت میں لیٹ کر واپس چلی جاتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان موجوں کے لیے ساحل کی نوکیلی ریت کے پاس موت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ موجیں جو اپنے محبوب ساحل سے وصال کے لیے تڑپتی ہوئی آتی ہیں زندگی بچا کر واپس گہرے سمندر کو لوٹ جاتی ہیں۔ میرے دائیں جانب بحیرہ عرب ہے تو بائیں جانب ایک بلند و بالا خوبصورت پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی پر شارجہ کے حکمران ڈاکٹر سلطان محمد کا محل ہے جنہیں عربی میں الشیخ الصاحب السموع کہتے ہیں۔ انہوں نے عرب کلچر میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اس لیے انہیں ڈاکٹر بھی کہتے ہیں۔ ان کا یہ محل اندر سے کس قدر خوبصورت اور پرشکوہ ہے اس کا تذکرہ آئندہ اوراق میں!

اردگرد کی آبادی میں اکثریت غیر ملکیوں کی ہے جن میں پاکستانی انڈین بنگالی اور سری لنکا کے لوگ نمایاں ہیں۔ کچھ تعداد فلپائنی اور مصری لوگوں کی بھی ہے اس ساحل کے قریب ہی شہر کی بڑی جامع مسجد ہے۔ عصر کی نماز کا وقت تھا عبدالقدوس مجھے وہاں لے گئے مسجد کسی ماہر آرکیٹیکٹ نے بنائی ہے۔ بہت وسیع ہال ہے جس میں 20 سے زیادہ اے سی لگے ہوئے ہیں۔ وضو کے لیے اونچے اینگل کاک لگے ہیں۔ نمازیوں کے لیے وضو کے بعد ہاتھ اور چہرہ سکھانے کے لیے ٹشو پیپر وافر مقدار میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک مقامی نوجوان فرش پر قرآن پاک رکھے تلاوت میں مشغول ہے اور میں سوچ رہا ہوں یہ اعرابی ہیں صحابہؓ کی اولاد ہیں۔ خدا انہیں اپنی سچی کتاب کی عزت وتکریم کی توفیق دے۔ اگر یہ نوجوان گوجرانوالہ کی کسی مسجد میں فرش پر اس طرح قران پاک پھیلا کر رکھتا تو جان سے جاتا۔ مسجد میں کثرت پاکستانیوں کی ہے جو دور سے ہی شلوار قمیص کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔

میں واپس آ کر دیکھتا ہوں کہ میرے بیٹے جگنو اور رافع اپنے کزنز کے ساتھ سارے پارک میں اودھم مچا رہے ہیں۔ قریب ہی ایک خوبصورت مصری جوڑا بیٹھا ہے اُن کا چھوٹا بیٹا بھی انہی کی طرح سرخ وسفید اور بہت ہی پیارا ہے۔ خاتون ساتھ ایک چھوٹی سی بھٹی بھی لے کر آئی ہے جیسی ہمارے ہاں تکے بنانے

والوں کے پاس ہوتی ہے۔ وہ صاحب کے لیے تکّے بھون رہی ہے۔ جن کی ظالم خوشبو ہم تک پہنچ رہی ہے۔ وہ نادان خاتون نہیں جانتی کہ میرے سامنے جو پاکستانی بیٹھا ہوا ہے یہ گوجرانوالہ کا ہے اور گوجرانوالہ کے باسیوں نے ہی تکّے ایجاد کیے تھے۔

آج ہمارا خیال تھا کہ خورفکان کے قابل دید مقامات جنہیں میرے بھائی نا قابل دید مقامات کہتے ہیں دیکھنے چلیں۔ دراصل ہمیں جو بیڈ روم دیا گیا تھا اس میں داخل ہوتے ہی نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ اس ساحلی شہر کے بعض مقامات صرف خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ قریب ہی کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا لیڈیز پارک ہے جس میں بچوں کے لیے خوبصورت ٹرین چلتی ہے۔ نفاست سے ترتیب دیے گئے لان جن میں پودوں اور گھاس کو پانی دینے کے لیے ایک خاص نظام ترتیب دیا گیا۔ میرے بھائی دراصل Flouri Culture کے انجینئر ہیں جو پھولوں کی افزائش کے ماہر ہیں۔ انہیں خاص طور پر یہاں بلوایا گیا تھا کیونکہ شارجہ کی زمین بنیادی طور پر تو Deseart ہے یعنی ریت ہی ریت۔ ایسی زمین میں سرسبزی اور شادابی کی سبزی بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہاں حد نظر تک سرسبز کھیت ہوتے ہیں وہاں کوئی اڑھائی نخل اُگا لے تو خود کو زمیندار سمجھتا ہے۔ زیر نظر پارک اور شہر کے سبھی پارکوں میں انہوں نے زیر زمین نالیوں کا اک جال پھیلایا ہوا ہے جس سے قطرہ قطرہ پانی پودوں کی جڑ اور گھاس پر ٹپکتا رہتا ہے۔ اس طرح انہوں نے بہت سارا علاقہ سرسبز بنالیا ہے۔

ع مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

اس لیڈیز پارک سے ذرا دور شہر میں ایک خواتین کا سینٹر بھی ہے۔ جس میں لائبریری ان ڈور گیمز اور دوسرے دلچسپی کے سامان ہیں۔ شارجہ کے حکمران بھی جب یہاں آئیں تو خواتین کے احترام کی وجہ سے ان دو جگہوں کے اندر نہیں جاتے۔ اُن کے اس احترام کا مظاہرہ میں نے عملی طور پر اس وقت دیکھا جب ایک مارکیٹ سے شاپنگ کر کے میں اور میری بیگم کلثوم نکلے جس کا مین گیٹ ریموٹ کنٹرول اور خود کار نظام کے تحت کھلتا ہے۔ دروازے کے قریب قدم رکھیں تو کافی بڑا شیشے کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ ہم دونوں اس گیٹ سے نکل کر باہر سڑک پر آئے۔ جس پر کافی ٹریفک تھی۔ سڑک کراس کرنا ہمارے لیے مشکل تھا۔ درمیان میں پہنچے ہی تھے کہ ایک کمرے جتنی چم چم کرتی خوبصورت گاڑی سڑک کے عین درمیان ہمارے سر پر آ پہنچی۔ گاڑی میں یقیناً رائل فیملی کے مرد سوار تھے۔ ہم نے یک لخطہ واپسی کی ٹھانی مگر گاڑی رُک گئی اور انہوں نے ہمیں آرام سے سڑک پار کرنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے دوسری جانب پہنچنے کے بعد انہوں نے سلام کیا اور آگے بڑھ گئے۔

ہماری رہائش سے تھوڑا اوپر پہاڑی پر ایک چھوٹا سا ڈیم بھی ہے۔ بھائی نے ہمیں وہ اوپر جا کر دکھایا۔ بہت بلندی پر بنا ہوا ہے۔ بارش وغیرہ کے پانی کو سٹور کرنے کے لیے جو وہاں کبھی کبھار ہوتی ہے اس ڈیم کے گرد بھی صرف ڈیڑھ دو درخت تھے جنہیں مقامی عرب سبزہ زار سمجھتے ہیں۔ وہاں سے ہم شارجہ کے شیخ کی زمینوں پر گئے۔ عبدالقدوس خود ہی ڈرائیو کر رہے تھے۔ آج ان کا سری لنکن ڈرائیور جسے میں ابراہم لنکن کہتا ہوں چھٹی پر تھا۔ خورفکان سے چند کلومیٹر دور ہم فارمز پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دور دور تک سبزہ اور لمبے لمبے درختوں کی قطاریں آویزاں تھیں۔ اتنی گریزی میں نے یو اے ای میں ابھی تک نہ دیکھی تھی اور آویزاں میں نے اس لیے کہا کہ تھا یہ بھی صحرا مگر اس پر چند فٹ قابل مٹی ڈال کر مصنوعی جنگل آباد کیے گئے تھے۔ یوں یہ جنگل میں منگل بن گیا تھا۔ بلکہ بدھ جمعرات بھی!

ان فارمز میں ہر طرح کی سبزیاں اور پھول بکثرت تھے۔ شارجہ کے شیخ نے خصوصی طور پر باہر سے ایسے بیج منگوائے تھے کہ جن سے لیڈی فنگرز کی طرح کے کھیرے یہاں بکثرت اُگائے جاتے تھے۔ ذائقہ اتنا اچھا کہ انہیں چھیلنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی۔ (مجھے اس قدر پسند آئے کہ اب بھی بھائی پاکستان آئیں اور آنے سے پہلے پوچھیں کہ آپ کے لیے وہاں سے کیا تحفہ لائیں تو میں یہی نفیس نرم نازک ٹیڈی اسمارٹ کھیرے ہی منگواتا ہوں)۔ یہاں سے تھوڑا آگے جائیں تو شیخ کی بیگم کی رہائش گاہ ہے۔ جس کی تزئین و آرائش خصوصی طور پر کی گئی ہے۔ شیخہ یہاں اکثر تشریف لاتی ہیں کیونکہ اس رہائش گاہ کی ٹیرس کے سامنے ہی سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ اس روز ساحل پر بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم ٹیرس پر گئے تو دیکھا وہاں ساگوان کی لکڑی سے بنائی گئی ایک بڑی دیدہ زیب بلیئرڈ کی ٹیبل پڑی ہے جسے صاف موی کاغذ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ جو ساحلی ہوا سے پھڑ پھڑا کر شور کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بس بڑے لوگوں کے بڑے شغل ہوتے ہیں۔ معاً سامنے سمندر پر نظر پڑی تو کچھ دور چند ایک کارگو بحری جہاز کھڑے نظر آئے۔ یہی جہاز مجھے کل اور اس سے پہلے بھی ایک دن تقریباً اسی جگہ سمندر میں نظر آئے تھے۔ اس

روز میں نے سمجھا کہ لنگر انداز ہیں۔ ایک دو روز میں رخصت ہو جائیں گے مگر مجھے بتایا گیا کہ یہ امریکن میرین جہاز ہیں جو یو اے ای کا مواصلاتی رابطہ دنیا سے بحال رکھنے میں اور سیکورٹی میں مدد دینے میں معاونت کرتے ہیں۔ جس کے عوض متحدہ عرب امارات اپنے سارے کل ریونیو کا 25 فیصد انہیں ادا کرتی ہے۔ یہ سن کر مجھے افسوس بھی ہوا کہ جب ہم اپنے ملکوں کی حفاظت ہی نہیں کر سکتے تو ہمیں ان پر حکومت کرنے کا کس قدر حق ہونا چاہیے۔

انہی سوچوں میں واپسی کی تیاری کی۔ مالیوں نے ہماری گاڑی کی ڈگی میں میرے پسندیدہ کھیرے سبزیاں اور نمکو شکو پلاسٹک کے بڑے شاپروں میں بند کر کے رکھا۔ گھر پہنچے تو بھابھی نے پرتکلف لنچ ہمارے سامنے رکھا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ مرغ قورمہ میں صرف لیگ پیس ہی ہر پلیٹ میں نظر آ رہے تھے۔

مجھے جاوید رسول نگری کی مزاحیہ نظم کا شعر یاد آیا۔

یارو بڑا اج وٹ شٹ لگدا اے
میرے تے کرایا کسے گٹ شٹ لگدا اے
ساڈی نیں پلیٹ وچ ہڈیاں ای ہڈیاں
اوناں دی پلیٹ وچ پٹ شٹ لگدا اے
سو سالہ بڈھیاں نوں باجی پیا آکھدا اے
کملا نماٹا کوئی جٹ شٹ لگدا اے
نشیاں وگاڑیاں نیں چن جیاں صورتاں
ہڈوں پیروں منڈا تے کوئی بٹ شٹ لگدا اے

میری حیرانی بھانپ کر بھابھی نے بتایا کہ آپ کو یہاں گردن یا چیسٹ پیس نہیں ملے گا۔ ہم مقامی مارکیٹ سے پیک گوشت لاتے ہیں جو بھی حصہ آپ کو پسند ہو اسی پر مشتمل یہ پیک ہوتا ہے۔ مارکیٹ کا ذکر آیا تو اسی شام ہم نے اس مارکیٹ جسے وطنی ''لولو'' کہتے ہیں پر دھاوا بول دیا۔ دور دور تک پھیلی ہوئی اس مارکیٹ میں بہت سے شعبے تھے۔ ایک ہی چھت کے نیچے کراکری گارمنٹس جوتے سٹورز اور کریانہ سبزی والی آئٹمز سے لے کر گوشت اور پرفیومز تک بے شمار ورائٹی دستیاب تھی۔ بعض سبزیوں اور پھلوں کو تو ہم پہچان بھی نہ سکے۔ ایگری کلچر والوں نے نت نئی بریڈنگ کر کے نہ جانے کیا کچھ بنا لیا ہے جسے سیب سمجھ رہے تھے وہ سفید شملہ مرچ تھی تو کہیں چھوٹے خربوزے کے سائز کا آلو بخارا پڑا تھا۔ کہیں سرخ رنگ کی گوبھی تھی تو کہیں رنگ برنگی مشرومز تھیں۔ عجیب وغریب قسم کے مشروبات اور جوس جو 100% حلال اور قدرتی تھے یعنی صرف فوڈ کلرز پر ہی مشتمل نہ تھے فلپائنی سیل گرلز بڑی مہارت سے کسٹمرز کو ڈیل کر رہی تھیں۔ مارکیٹ کے ایک حصے میں ایک صاحب ہمارا ڈاکٹروں والا اوور آل پہن کر بڑی متانت سے کھڑے تھے دور سے ایسا لگتا تھا جیسے ایف آر سی ایس سرجن ہیں۔ پاس گئے تو پتہ چلا کہ حضرت قصائی ہیں اور بغدا، وچھری سے لیس ہیں۔ صد شکر کہ بغل میں چھری اور منہ سے رام رام نہیں کہہ رہے تھے۔ ہم نے وہاں سے دوپہر کے کھانے کی کاپی کرنے کے لیے کچھ پیکٹ لیگ پیس اور قیمے کے خریدے جبکہ جگنو اور رافع نے مبلغ ایک ٹرے چاکلیٹ خریدے۔ جگنو تو اب بھی کف افسوس مل مل کر کہہ رہا تھا (اس کے کف ملنے سے گندے ہو رہے تھے)

''ابو بس اتنے تھوڑے سے چاکلیٹ؟''

میں نے اسے ہنستے ہوئے تسلی دی اور کہا ''تو اور کیا تمہارے لیے گدھے پر لاد کر چاکلیٹوں کا بورا لے کر آؤں؟''

مارکیٹ میں مخمل کے بنے بے بی کارٹ بڑی چابک دستی سے سجائے گئے تھے۔ ایک کارٹ میں رافع اور اس کی چھوٹی کزن کو بٹھا کر تصویریں بنائیں تا کہ دوستوں کو دکھا کر رعب ڈالا جا سکے۔

واپسی پر بھائی نے ہمیں ایک جدید فرنشڈ کالونی دکھائی جس میں مختلف قسم کے گھر بنے ہوئے تھے۔ مگر مکین کوئی نہ تھا۔ پتہ چلا کہ شارجہ کے شیخ کی جانب سے بے گھر وطنی لوگوں کے لیے یہ گھر بنائے گئے ہیں جن میں ضرورت اور سہولت کی ہر چیز مہیا کی گئی ہے۔ مگر یہاں رہنے کو کوئی نہیں آتا۔ حالانکہ اس کے لیے صرف ایک سادہ ورق پر درخواست کی ضرورت ہے۔

''مگر لوگ کیوں نہیں آتے پاکستان میں ایسا ہوتا تو لوگ ان گھروں کو حاصل کرنے کے لیے مرنے مارنے پر تل جاتے'' میں نے حیران ہو کر بھائی سے پوچھا۔

''وطنی لوگ اس بات میں بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں'' مجھے بتایا گیا انہی باتوں میں ہم واپس آتے ہوئے گھر کے قریب ہی اتر گئے۔ سامنے والے ولا کے گیٹ پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ کلثوم نے انہیں سلام کیا تو کہنے لگیں ''آ جاؤ آ جاؤ'' پتہ چلا کہ خاتون انڈین ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر عربی سے شادی کی جو چند سال قبل راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے پہلی بیوی سے بھی بچے تھے اور اب ہر دو قسم کے بچے اس خاتون کے زیر سایہ ہیں۔ کلثوم کے اس بات پر اظہار تاسف پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی کہنے لگی۔

''انڈیا میں بھوکے مرتے تھے۔ اب کم از کم ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بچوں کے لیے حکومت شارجہ نے اچھا خاصا ماہانہ وظیفہ لگایا ہوا ہے۔ زندگی کی ہر

سہولت انہوں نے مہیا کی ہوئی ہے۔ جو بچہ بالغ ہو اس کی شادی کے لیے ستر ہزار درہم کی مدد اس کے علاوہ دیتے ہیں۔ ابھی گریجویشن کی نہیں تو نوکری بھی فٹافٹ مل جاتی ہے۔ میں اس نیک بخت کی گفتگو سن کر سوچ رہا تھا کہ جمہوریت کی برکتوں سے مستفید ہونا اپنی جگہ مگر شارجہ کے وطنی لوگوں کو جو مزہ شہنشاہیت دے رہی ہے وہ سواد جمہوریت کہاں دے سکتی ہے۔ اپنے ہاں تو Job less ness ہی جینے نہیں دیتی۔ مجھے فرنشڈ خالی کالونی پھر یاد آ گئی۔ دل سے چپکے چپکے دعا نکل رہی تھی۔ اے خدا ہمیں جمہوریت کی برکتوں سے بچا۔ اسے شہنشاہیت کا تڑکا لگا! اس میں خلیج والے مصالحے ڈال میرے مولا تا کہ ہماری زندگی میں بھی رنگ وروغن کا دور دورہ ہو۔

جی ہاں آج ہم نئی دنیاؤں کی چاہ میں جا رہے ہیں کہاں؟ یہ ہمیں پتہ نہیں۔ ہمیں بلدیہ کی طرف سے نیو سی نسان ملی ہوئی ہے۔ سفر آغاز کرتے ہوئے جب منزل کا پتہ نہ ہو تو بندہ مسافر نہیں سیاح بن جاتا ہے۔ کیونکہ سیاح کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اُسے بیوی بچوں کے بکھیڑے کا بھی کوئی ڈر نہیں ہوتا (مگر میرے تو بیوی بچے بھی ساتھ تھے) کیا میں سیاح ہوں یا مسافر؟ یہ سوچتے ہوئے میں اگلی بائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھنے لگا کہ پاکستان میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر بھائی نے ٹوکا کیونکہ خلیج سعودی عرب اور کویت عراق وغیرہ میں ٹریفک دائیں طرف چلتی ہے۔ گاڑی میں ڈرائیور بائیں جانب بیٹھتا ہے اور مجھے سواری کی حیثیت سے گاڑی کی پہلی دائیں والی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ کیونکہ یہ پاکستان نہیں امارات ہے۔ مجھے کہا گیا کہ بیلٹ ضرور باندھ لوں نہ باندھنے پر 500 درہم جرمانہ ہو سکتا ہے سامنے سڑک پر پول لگے تھے پتہ چلا کہ اگر کوئی شتر بے مہار قسم کا ڈرائیور یہ پول گاڑی مار کر Damage کر دیتا ہے تو 5000 درہم جرمانہ ہونا یقینی امر ہے۔ 500 درہم سے کم نہیں ہو سکتے تو بولے ''اس سے کم میں ''وارا'' نہیں۔ چاہے وہ رائل فیملی ہی کا آدمی کیوں نہ ہو۔ کچھ عرصہ پہلے تک امارات دنیا میں واحد ملک تھا جہاں ٹریفک اشارے نہیں تھے۔ بس ہر جگہ جہاں ٹریفک کا زور ہوتا تھا وہاں Round about بنا دیتے تھے۔ ساری ٹریفک اس گول چکر میں غرق ہو جاتی تھی جسے وہ پھر اطراف میں بنی سڑکوں پر اُگل دیتا تھا۔

خورفکان میں ہمارا پڑوسی ایک عمر رسیدہ عرب تھا جس نے کچھ بکریاں گھر میں پال رکھی تھیں۔ جگنو اور رافع جب ان سادہ دل بکریوں کو چھیڑتے اور بھاگنے کی تیاری کرتے تو وہ بوڑھا عرب ان کے تعاقب میں سارے محلے کا چکر کاٹتا ہم بچوں کو اسی شغل میں محو چھوڑ کر آگے بڑھے تو ایک کشادہ اور وسیع ادارے کی پارکنگ میں جا کھڑے ہوئے۔ یہ شہر کا ہسپتال تھا جہاں سے ہمیں Vaccine لگوانا تھی۔ میں نے پاکستان میں شیخ زید ہسپتال اور ڈاکٹرز ہسپتال دیکھے ہیں جو بلاشبہ بہت خوبصورت صاف ستھرے اور انتہائی ماڈرن ہیں۔ مگر یہ ہسپتال تو اپنی مثال آپ تھا۔ سامنے ہی بہت بڑی ابھری ہوئی شیخ زید بن سلطان النہیان کی فوٹو آویزاں تھی۔ ایک بھاری بھرکم میٹرن (یعنی نرسوں کی ''بے بے'') سامنے براجمان تھیں جنہوں نے ہمیں Vaccine لگائی۔ ہسپتال کا فرش واقعی آئینے کی طرح تھا۔ کیونکہ اس میں سے ہمارا فوٹو نظر آ رہا تھا۔ مجھے بھابھی نے بتایا تھا کہ ان کے بیٹے کی پیدائش اسی ہسپتال میں بڑے آپریشن سے ہوئی۔ اس قدر اعلیٰ توجہ اور Care تھی کہ ذرا تکلیف نہ ہوئی۔ میں نے سوچا بچے کی پیدائش کے لیے ادھر پاکستان میں بڑا آپریشن تو میں بھی اپنے ہسپتال میں کرتا ہوں مگر چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ ہسپتال کا مستعد عملہ ہر وقت صفائی میں مصروف عمل رہتا ہے بلکہ اس میدان عمل میں ہر پل کودتا رہتا ہے۔ اسی ہسپتال میں بڑے سرجن اپنے کراچی کے اعجاز صاحب ہیں۔ لندن سے ایف آر سی ایس کر کے کراچی گئے پھر یہاں آ کر جم گئے۔ ہم ملنے گئے تو بہت خوش ہوئے۔ بڑی اپنائیت سے ملے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کراچی میں جن ہسپتالوں میں کام کرنے کا آپ بتا رہے ہیں وہ تو بڑے معروف ہیں۔ پھر آپ نے پاکستان کیوں چھوڑا؟''

کہنے لگے ''بس کیا بتاؤں شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ میں تو اپنی دھرتی ہی کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر کراچی کے حالات ہی بہت خراب تھے۔ ایک آپریشن کر کے آیا ہوں تو بھتہ لینے والے پہنچ جاتے تھے۔ وہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کبھی ایم کیو ایم والوں کا خوف، کبھی ٹارگٹ کلنگ کا ڈر''

میرے پیارے وطن! دل سے آہ نکلی۔ تیرے ذہین بیٹے چند بے وقوفوں کی وجہ سے کب تک تیری گود سے بھاگ بھاگ کر دوسری دنیاؤں کو سنوارتے رہیں گے۔ نئی دنیاؤں کی چاہ میں کریم آف دی نیشن کب تک بھٹکتی رہے گی۔ اسی ہسپتال کے شعبہ امراضِ چشم میں گئے وہاں بھی شعبہ کے سربراہ سرجن شاہد صاحب لاہور کنگ ایڈورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اپنے وطن کو یاد کرتے کرتے آنکھیں بھگوتے رہے۔

اب چاہیں بھی تو پاکستان کیسے واپس جائیں۔ امارات میں بھی SET نہیں تھے۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب پاکستانی روپوں میں تنخواہ تھی مگر گھریلو حالات سے پریشان ہمیں ملٹی نیشنل پاسپورٹ دکھا کر بتانے لگے کہ اب امریکہ جانے کا ارادہ ہے۔ دل سے پھر ہوک اُٹھی میرے وطن کا سرمایہ کہاں کہاں بھاگے گا جنگل خوار ہوگا۔

ہسپتال سے بوجھل دل لیے نکلے۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب اور شاہد صاحب کی وسیع لگژری رہائش گاہیں قریب ہی ہیں۔ اعجاز صاحب کی رہائش تو بالکل ساحل کے اوپر ہے جس کے صحن میں کھڑے ہوں تو سامنے سمندر چھلانگیں مارتا نظر آتا ہے۔ ہماری گاڑی بھی اب چھلانگیں مارتی ہوٹل Beach view کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دور بہت دور جارہی ہے۔ اس نے شہر کی رونقیں پیچھے چھوڑ دی ہیں۔ تقریباً پندرہ کلومیٹر آگے جا کر گاڑی ایک بہت ہی پرانی اور خستہ عمارت کے پاس رُک گئی ہے۔ ایک طرف چیختا ساحل دوسری طرف یہ خاموش پرسکون عمارت سر جھکائے کھڑی ہے۔ پاس گئے تو پتہ چلا کہ 700 ہجری میں بنائی گئی یہ مسجد ایک تاریخی ورثہ ہے۔ اس میں کوئی لوہا یا دھات استعمال نہیں ہوئی اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے اس زمانے کے ماہر کاریگروں نے صرف چونے اور پتھر سے یہ مسجد تخلیق کی جو اَب تک قائم و دائم ہے۔ وضو کے لیے اس دور میں بنائی گئی پرانی بوسیدہ کھوئی بھی موجود ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کا ایک بورڈ سامنے نظر آ رہا ہے جس پر اس عمارت کے خدوخال کے بارے لکھا ہوا ہے۔ مسجد کے اندر گئے تو ایک فرحت بخش احساس ہوا۔ خلیج کی گرمی اور اس مسجد میں کوئی اے سی نہیں، پنکھا نہیں پھر بھی اندر ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ سجدے جبین نیاز میں مچل رہے تھے۔ سو یہاں ادا ہو گئے۔ اس تاریخی مسجد کو سیاح دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ ایک بانکی سجیلی ٹورسٹ بس ابھی یہاں آ کر رُکی ہے۔ بہت سے غیر ملکی خواتین و حضرات بس سے نکل کر اس مسجد کی فوٹو بنا رہے ہیں۔ کچھ ساحل کے اردگرد پھیل گئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس گروپ میں ایک ☆''ض'' ضعیف آدمی جس کی کمر خمیدہ اور ٹانگیں خم کھا کر بریکٹ کی طرح ہو گئی ہیں ایک خاتون کے ساتھ سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس بڑھاپے اور قریب المرگی کے عالم میں دنیا دیکھنے کا شوق مجھے بڑا دلچسپ لگا۔ میں نہ رہ سکا اور اس کے قریب چلا گیا۔ انگلش میں حدود اربعہ پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ بانکے سجیلے بوڑھے ہالینڈ کے رہنے والے ہیں۔

''بڑے میاں! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''
میں نے جستجو بھرے لہجے میں پوچھا تو انہوں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے۔ مسکرائے اور ایک پھیرا لیا پھر مجھے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے۔ میں زندگی کو انجوائے کر رہا ہوں۔ میں فطرت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ دیکھو یہ ساحل کس قدر خوبصورت ہے۔ یہ تاریخی مسجد کتنی پیاری ہے۔ اپنے گھر میں چارپائی پر ایڑیاں رگڑنے سے یہاں پھرنا مجھے زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔

ہم یہاں سے چلے تو بھائی نے گھر واپس جانے کی بجائے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کئی کلومیٹر چلنے کے بعد ایک شہر ''دباء'' آیا پھر آگے سمندر ہی سمندر تھا۔ آج ہم لانگ ڈرائیو پر نکلے ہوئے تھے۔ ہماری کوئی منزل نہ تھی۔ چلتے چلتے سمندر ایک طرف دور ہو کر استراحت کرنے لگا۔ اب ہمارے سامنے بے آب و گیاہ بلند پہاڑ تھے جن پر صدیوں کی بارشیں اور موسم اپنے اثرات چھوڑ گئے تھے۔ یہ قطر کا علاقہ تھا۔ ساحل پر پڑے بڑے بڑے پتھر سمندر کی خودسر موجوں کی زد میں نہ جانے کتنے سالوں سے بکھرے پڑے تھے جو کسی جیالوجسٹ کے منتظر تھے کہ کوئی طبقات الارض کا ماہر آئے اور ان پر تحقیق کر کے بتائے کہ اس جگہ سمندر سے پہلے کیا تھا۔

ہماری گاڑی اب واپسی کے لیے تیار تھی۔ ہمارا گھر وہی سمندر کا پیارا سا کنارہ اور اس پر بکھرے ہوئے مختلف رنگ و نسل کے لوگ ہمیں نظر آ رہے تھے۔ بھائی نے مجھے پرانا خورفکان بھی دکھایا۔ پرانا قصبہ بتا رہا تھا کہ تیل کی دولت جب خلیج میں ظاہر نہیں ہوئی تھی تو یہاں کے لوگ خستہ حال مکانوں میں گزارا کر رہے تھے۔ سمندر کے کنارے بہت چھوٹی مچھلیوں کے ان گنت ٹکڑے سوکھنے کے لیے یہ لوگ رکھ چھوڑتے تھے جن کا مظاہرہ آج واپسی پر بھی چند ایک جگہوں پر میں نے دیکھا۔

''اب جب کہ بے بہا دولت ان کے پاس آ گئی ہے پھر یہ مچھلیاں کیوں سکھاتے ہیں؟'' میں نے بھائی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پرانے بابے گزرے ہوئے زمانہ کو یاد کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور بعض ضعیف لوگ تو پرانے اُجڑے ہوئے خورفکان میں بھی دو چار روز رہ کر آتے ہیں۔ شاید عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں!

ناران، کاغان اور مری کا سفر

ایم آر شاہد/ لاہور

پچھلے سال کی طرح اس سال بھی دوستوں کے ساتھ عید کے دوسرے روز سیر کرنے کا پروگرام بنایا۔ گزشتہ سال کشمیر میں چار دن گزارے تھے اس بار ناران، کاغان اور مری کا ٹور تھا۔ عبدالوہاب نے یہ ساری جگہیں دیکھی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ ہمارا راہنما بھی تھا اور ٹور کا ساتھی بھی۔ ویسے بھی اللہ کے اس بندے نے تھوڑی عمر میں بہت سی دنیا دیکھی ہے۔ پچھلے سال ہمارے ساتھ ملک ریاض، محمود، ذکاء الرحمٰن اور عاصم کمال تھے۔ اس بار یہ اپنی مجبوریوں یا مصروفیات کے باعث نہ جا سکے۔ ان کی جگہ پر تین نئے بھرتی کیے گئے جو عبدالوہاب کے دوست تھے۔ ان میں عمر، ولید ناصر اور عبدالرحمٰن آخری ٹائم پر دو ساتھی چھوڑ گئے۔ ہم تین رہ گئے۔ میں عبدالوہاب اور عبدالرحمٰن۔ کیونکہ میری دلی خواہش تھی کہ اس بار نئے شمالی علاقے دیکھے جائیں، میری آرزو کا خیال کرتے ہوئے عبدالوہاب نے کہا کوئی بھی نہ جائے میں آپکے ساتھ جاؤں گا۔ گزشتہ سال جانے والے چھ کے چھ کردار عجیب تھے۔ اس بار جانے والے تینوں عجیب تھے۔ ملک ریاض کی ضد تھی کہ میں اے پی ایس گاڑی کے بغیر نہیں جاؤں گا، جبکہ عبدالوہاب کا ارادہ کیری ڈبہ بک کروانے کا تھا۔ عید کا دوسرا روز دوستوں کے پروگرام بدلنے میں گزر گیا۔ عید کے تیسرے دن رات ساڑھے دس بجے مانسہرہ کے لیے چار ٹکٹیں بک کروائیں۔ چوتھے ساتھی ولید ناصر نے عین موقع پر جانے سے انکار کر دیا۔ آخر میں ہم تین دوست رات کو ساڑھے دس بجے مانسہرہ کے لیے روانہ ہوئے اور صبح ساڑھے پانچ بجے وہاں اڈے پر پہنچے۔ یہ 5 ستمبر 2017 ہے۔ اڈے سے گاڑی کروائی ناران کیلئے۔ راستے میں ساڑھے سات بجے ایک دریا کے کنارے ناشتہ کیا۔ یہاں فیصل آباد سے آنے والے کچھ ٹورسٹوں سے ملاقات ہوئی۔ لوگوں کو قائل کرنا، دل میں اتارنے کا فن عبدالوہاب کو خوب آتا ہے۔ ان سے پروگرام طے پایا کہ جہاں جہاں جانا ہے اکٹھے جائیں گے۔ اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ آٹھ بجے کیوائی پہنچے اور پھر بارہ ساڑھے بارہ کے قریب ہم ناران پہنچے۔ بالاکوٹ سے پیچھے ہی منزل تک پہنچنے کا ایک سہانا سفر شروع ہوا۔ کارپٹ سڑک پر چلتے ہوئے دریا کہنار کا پانی ساتھ ساتھ تھا۔ اور دائیں بائیں دیکھیں تو سبزہ ہی سبزہ تھا۔ یوں ہم خوبصورت وادی کاغان میں داخل ہوئے۔ سامنے وادی ناران کے سحر انگیز مناظر تھے۔ جیسے قدرت نے سچ میں ان جگہوں کو پریوں کا مسکن بنایا ہو۔

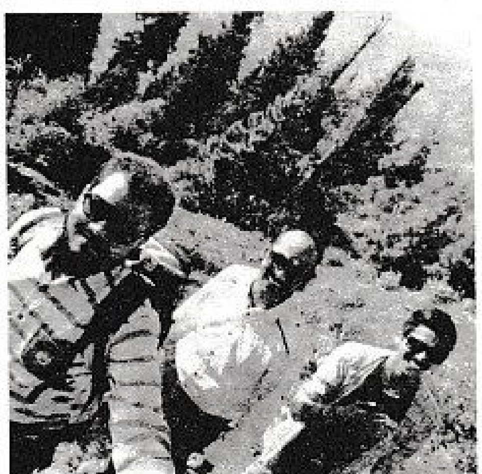

سرمئی گلیشیئر ناران: کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد

سرمئی گلیشیر سیاح کا استقبال کرتا ہے۔ استقبال بھی ایسا کہ ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ یہ گلیشیر راستے میں ناران بازار سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر آتا ہے۔ تمام سیاح اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں رکتے ہیں۔ ناران میں ہم نے پنجاب تکہ ہاؤس کے ساتھ پربت ہوٹل میں دو کمرے لیے ایک فیصل آباد والوں نے لیا اور ایک ہم نے لیا۔ یہ کمرے گراؤنڈ فلور پر تھے۔ اچھے تھے اور لوکیشن بھی اچھی تھی۔ کمرے میں سامان رکھا۔ باہر ہوٹل سے چائے پی اور ایک گھنٹہ کمرے میں ریسٹ کیا اس کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور جیپ میں جھیل سیف الملوک دیکھنے چلے گئے۔ جھیل سیف الملوک: اب ہمارا سفر پریوں، شہزادوں اور دیو کے مسکن جھیل سیف الملوک کی جانب شروع ہوا۔ راستے میں پہاڑوں پر بادلوں کا بسیرا تھا اور جگہ جگہ راستے میں گلیشیئر سفر کو خوب صورت اور رنگین بنا رہے ہیں۔

ناران سے سیف الملوک تک جیپ کا کرایہ 2500 روپے ہے۔ جو وہاں دو یا ڈھائی گھنٹے کی سیر کے بعد واپس ناران پہنچا دیتی ہے۔ بالآخر پرخطر مگر دلکش سفر کے بعد ہم جھیل سیف الملوک پہنچ گئے، حدنگاہ تک برفیلے پہاڑوں کے بیچ میں نیلے رنگ کی خوبصورت جھیل ہے جھیل پر نظر پڑتے ہی ہم بھی اس قدر محور رہے کہ کچھ دیر کے لیے حیران و پریشان رہ گئے۔

جھیل سیف الملوک سالہا سال سے ملکہ پربت کے پانیوں سے آباد ہے پہلے یہ سفر پیدل یا خچر پر طے کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ سفر جیپوں کے ذریعے بھی طے کیا جاتا ہے۔ کچھ منچلے دور دراز سے موٹر سائیکلوں پر بھی آتے ہیں۔ اس جھیل سے وابستہ شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کی رومانوی داستان بہت مشہور ہے۔ جھیل کے کنارے داستان گو یہ داستانیں سنا کر سیاحوں سے پیسے بھی کماتے ہیں۔ یہ پیالہ نما جھیل خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً 1420 فٹ اور چوڑائی 450 فٹ کے قریب ہے وہاں ہم نے تصاویر بنوائی اور عبدالوہاب نے تھوڑی مووی بھی بنائی۔ میں نے اور

عبدالرحمن نے ہاف بازو شرٹ پہن رکھی تھی وہاں پہنچے تو ہمیں سردی نے گھیر لیا۔ دانت سے دانت بجنے لگے وہاں سے گرم گرم مکئی کا سٹا کھایا تو سردی میں کمی واقع ہوئی۔ شام سات بجے واپس پربت ہوٹل پہنچے۔ کچھ دیر آرام کیا، فریش ہو کر رات کھانے کے لیے عبدالوہاب کو کہا تو کہنے لگا۔ یہیں لے آؤ۔ ہم دونوں دال ماش اور گرم گرم روٹیاں لے آئے۔ بگڑے نواب نے کھانے سے انکار کر دیا کہ میں تو تکے کھاؤں گا۔ بعض اوقات ایسے دوستوں کے نخرے سہنے پڑتے ہیں۔ خیر ہم نے مل جل کر کھانا کھایا اور سو گئے۔

6 ستمبر 2017 ہوٹل سے نہا دھو کر قریبی ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا۔ فیصل آبادی عثمان وغیرہ کے ہمراہ بابوسر ٹاپ کے لیے کیری ڈبہ کرائے پر لیا۔ بابو سر ٹاپ تقریباً 13 ہزار فٹ بلندی پر گلگت کے راستے پر واقع ہے۔ ہم اپنی گاڑی پر سوار ہوئے اور تین گھنٹے ڈرائیو کے دوران حسین مناظر سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہوئے بابوسر ٹاپ پہنچے۔ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے ہم آسمان کے کسی حصے پر آ گئے ہوئے ہوں۔ ہر طرف دل فریب اور سحر انگیز مناظر تھے یہاں بھی سردی بہت زیادہ تھی، دوست سلفیاں بناتے رہے اور کچھ مووی بھی بنائی۔ وہاں ابلے ہوئے انڈے کھائے مگر چائے مزیدار نہ تھی، ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ برف باری بھی ہونے لگی۔ بڑا خوبصورت منظر تھا واپسی پر لولوسر جھیل رکے۔ جھیل لولوسر یہ سحر انگیز اور جادوئی جھیل سطح سمندر سے تقریباً 11200 فٹ کے اونچائی پر ہے۔ یہ جھیل ناران سے 50 کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے، اس کے قریب ہی پوربی نار کا مقام ہے۔ جہاں انگریزوں نے سینکڑوں مجاہدین شہید کر دیے تھے۔ اس لیے اس جگہ کو شہید کمہ بھی کہتے ہیں۔ جھیل لولوسر کے علاقے کو مختلف دیو، جنوں اور پریوں کی کہانیاں اسے جادوئی بناتی ہیں۔ یہ مکمل غیر آباد علاقہ ہے۔

اس جھیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار مغل بادشاہ کی نابینا بیٹی نے اس جھیل میں غسل کیا تو اس کی بینائی لوٹ آئی۔ جھیل لولوسر کا سفر انتہائی خوبصورت ہے راستہ پکی سڑک کا ہے۔ یہاں ایک جھونپڑی نما چائے کے ڈھابے میں دوستوں نے گٹار پر گانے گا کے دلپشوری کی۔ سفر بہت آراد دہ اور خوبصورت تھا۔ جھیل کا سبز پانی اپنے اندر ایک عجیب سا سکون سمیٹے ہوئے تھا۔ یہاں سے واپسی پر جل کھڈ رکے، چائے پی اور پھر چل پڑے اور راستے میں پیالہ جھیل آتی ہے یہ بھی خوبصورت پیالہ نما گول جھیل ہے، کوئی شام پانچ بجے کا ٹائم تھا۔ پیالہ جھیل پر عبدالوہاب نے دوستوں کے ساتھ مختصر ڈاکومنٹری بنائی۔

واپس جب ناران پہنچے تو عشاء کی نماز کا وقت

ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر کچھ دیر آرام کیا اس ہوٹل میں قیام کا ہمارا دوسرا دن ہے۔ پھر رات کا کھانا کھانے پنجاب ریسٹورنٹ میں مچھلی کھائی اس کے بعد رات کو بازار میں چلے گئے وہاں سے عبدالوہاب نے خشک میوہ لیا۔ ہوٹل واپس آئے رات کا ڈیڑھ بج گیا اور آ کر کمرے میں سو گئے۔

7 ستمبر 2017 بروز جمعرات: صبح حسب عادت 9 بجے اٹھ بیٹھا، شیو بنائی اور باقی دوستوں کو جگایا، تیار ہوئے اور باہر نکل کر پنجاب ریسٹورنٹ سے انڈے فرائی پراٹھے اور چائے سے ناشتہ کیا۔ ساتھ والے فیصل آبادی دوستوں نے انتظار نہ کیا۔ کمرہ خالی کر کے اگلی منزل کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم ناران سے ویگن میں بیٹھ کر کے عرائی پہنچے۔ آج ہمارا سری پائے جانے کا پروگرام تھا کیوائی سے جیپ لی اور سری پائے پہنچے۔ یہاں گھومتے رہے، ساڑھے تین کا وقت تھا۔ یہ پہاڑی سلسلہ بہت طویل ہے۔ ہم اوپر پیدل چلتے رہے۔ اس دوران چائے پی، سیلفیاں بنائیں۔ ایک دوکان پر گیت جب آئے گا عمران بنے گا نیا پاکستان چل رہا تھا۔ دونوں نے اس گیت پر ڈانس کیا۔ ساتھ زبردستی عبدالرحمن نے مجھے بھی گھسیٹ لیا، پھر آگے چلتے رہے یہاں سے نیٹ پر لاہور محمد یٰسین بدر اور ملک عارف سے بات ہوئی اور یہاں کے نظارے موبائل کو گھما کر دکھائے۔ اس بہانے گھر والوں سے رابطہ بھی ہو گیا۔ اس سے آگے شنکیاری ٹاپ ہے۔ وہاں گھوڑوں پر سفر کیا۔ یہ کوئی آنے جانے کا دو گھنٹے کا سفر ہے۔ پہاڑ کی اونچائی کے لئے ہم نے تین گھوڑے کرائے پر لیے 21 سو میں بات طے ہوئی۔ بڑا خوف ناک راستہ تھا۔ گھوڑوں کے مالک ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اس مقام پر کوئی کوئی جاتا ہے۔ لمبا سفر ہے اور ایڈونچر ہے۔ ہزاروں فٹ گہری دائیں بائیں کھائیاں ہیں۔ اوپر نظر اٹھائیں تو خوب صورت مناظر نظر آتے ہیں۔ دائیں بائیں پہاڑوں سے بادل ٹکراتے نظر آتے ہیں۔ نیچے دھیان پڑ جائے تو گہری کھائیاں دیکھ کر خوف کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ ٹاپ پر پہنچ کر عبدالوہاب نے مختصر ڈاکومنٹری بنائی اور تصاویر بنائیں۔ کچھ دیر یہاں ٹھہرے، شام ہو گئی۔ اب واپسی کی فکر لاحق ہو گئی۔ جب ہم اوپر جا رہے تھے ان دونوں کے گھوڑے آگے آگے تھے میرا گھوڑا سب سے پیچھے تھا۔ واپسی پر میں نے گھوڑا بدل لیا اور واپسی کی راہ لی۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد سطح پہاڑ پر آئے۔ سانس میں سانس آئی، جیپ والا

ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ جس چوٹی پر ہم پہنچے تھے اس کے سامنے مکڑا پہاڑ سینہ تانے کھڑا نظر آتا ہے۔ اس کی اونچائی اور بھی زیادہ ہے۔ جیپ میں بیٹھ کر شوگراں پہنچے۔ یہ بڑی پرسکون جگہ ہے۔ جس ہوٹل میں ٹھہرے اس کا نام الفیصل ہوٹل ہے۔ یہاں عبدالوہاب کی اپنے پرانے کلاس فیلو کامران فیصل آبادی سے ملاقات ہوگئی۔ جو پورے گروپ کی شکل میں اپنی گاڑی کوچ لیکر آئے ہوئے تھے۔ گپ شپ چلتی رہی۔ کمرے میں آکر اے ڈبلیو نے چائے بنائی ہمیں پلائی اور خود سو گئے۔ اور چائے بھی نہ پی۔ وہ ویسے ہی کپ میں پڑی رہی۔ اس کے بعد ہم بھی تھکے ہارے تھے سو گئے۔ مگر اس دوران کئی بار آنکھ کھلی، اسی طرح رات بیت گئی۔ شوگراں کا مقام قدرت کا ایک حسین نمونہ ہے۔ وسیع و عریض میدان، سرسبز گھاس اور پھولوں کی کیاریاں دل کو لبھاتی ہیں یہاں کی آب و ہوا بہت خوبصورت ہے۔ سری پائے کا فاصلہ یہاں سے 6 کلومیٹر ہے۔ شوگراں سے ناران کا سفر تقریباً تین سے چار گھنٹے کا ہے۔

وادی کاغان کی سب سے اہم سیاحت کی وادی وادی ناران ہے۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً 8200 فٹ بلند ہے۔ 8 ستمبر 2017 بروز جمعہ: صبح شوگراں (الفیصل ہوٹل) میں صبح اور دوپہر کا ناشتہ اور کھانا اکٹھا کھایا۔ ایک دوست باہر گھومنے نکل گیا اور دوسرا سوتا رہا۔ رات ایک کلو کڑاہی بنوائی تھی جو بچی اسے کینٹین والے کے پاس فریج کروادیا تھا کہ صبح ناشتے میں کام آئے گی۔ 12 بجے تھے جب نیچے آئے عبدالوہاب نے کینٹین میں جا کر اپنے ہاتھ سے پراٹھے بنائے۔ انہوں نے سالن گرم کر دیا۔ انڈے فرائی کیے اور چائے دی۔ ہم تینوں نے سیر ہو کر ناشتہ اور کھانا اکٹھا ہی کر لیا۔ یہ ہوٹل کا صحن ہے ارد گرد سبزہ اور پھول ہیں۔ دھوپ میں بیٹھ کر ناشتہ کرنا اور بھی اچھا لگا۔ کھانا کھاتے کھاتے ایک ڈیڑھ بج گیا۔ اپنا سامان کلوز کیا اور نیچے جیپ میں رکھا۔ جیپ والے نے ہمیں کیوائی اتارا۔ اس دوران بھی ہم چاروں اطراف خوب صورت مناظر، حسین سرسبز وادیوں کا نظارہ کرتے رہے اور محظوظ ہوتے رہے۔ یار لوگ اپنی اپنی پسند کے گیت گاتے اور موبائل پر سنتے رہے۔ وہاں سے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور مانسہرہ اڈے پر پہنچے، پھر یہاں سے کیری ڈبہ کے ذریعے ہم مری کارروڈ جمال لاج ہوٹل میں آئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ سید بلال ہمارے دوست (مری کے رہائشی) ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ گھر میں ان کے ایک شادی تھی اس لیے کافی مہمان جمع تھے۔ اس لیے انہوں نے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام اپنے گھر کے پاس ہی ہوٹل میں کر دیا۔ یہ ان لوگوں کی محبت اور میزبانی کا سلیقہ ہے۔ کیونکہ ہم نے انہیں دو دن پہلے بتایا تھا کہ ہم تین دوست سیر کے لیے نکلے ہیں دو دن مری میں قیام کریں گے۔ انہوں نے کہا ویلکم۔ میں انتظار کروں گا۔ رات کے کھانے کا انتظام ہوٹل میں ہی کر دیا۔ بلال بھائی ہمارے پاس ایک گھنٹہ گپ شپ میں مصروف رہے اور صبح ناشتہ گھر پہ کرنا ہے کہہ کر چلے گئے۔ تاکہ ہم آرام کرسکیں۔ ہوٹل میں وائی فائی کی سہولت تھی، رات کو انٹرنیٹ پر خوب انجوائے کیا۔ ہمارا کمرہ نمبر 104 تھا۔ چائے پی۔ مسٹر عبدالوہاب نے دو تین موبی دیکھنے کا پروگرام بنایا اور نہ سونے کی قسم کھا کر موبائل پر صبح سات بجے تک تین مختلف اردو اور پنجابی موویز دیکھتا رہا۔ اور میں اس کا منہ دیکھتا رہا۔ کیونکہ لائٹ جلتی رہی اور میں سو نہ سکا تھا۔ طبیعت میں چڑچڑاپن تھا اور رات شوگراں میں بھی پوری طرح نیند نہ آئی تھی۔ دوسرا ساتھی عبدالرحمن میٹھی نیند کے مزے لیتا رہا۔

9 ستمبر 2017 بروز ہفتہ: صبح سات بجے عبدالوہاب سو گیا۔ میں بھی کچھ دیر لیٹا رہا۔ پھر 9 بجے اٹھ کر روٹین میں شیو بنائی۔ بھلا ہو بڑے بھتیجے عامر سعید کا جس نے سفر میں کام آنے کے لیے الیکٹرک شیونگ مشین گزشتہ سال بھیج دی تھی۔ جو میرے پچھلے

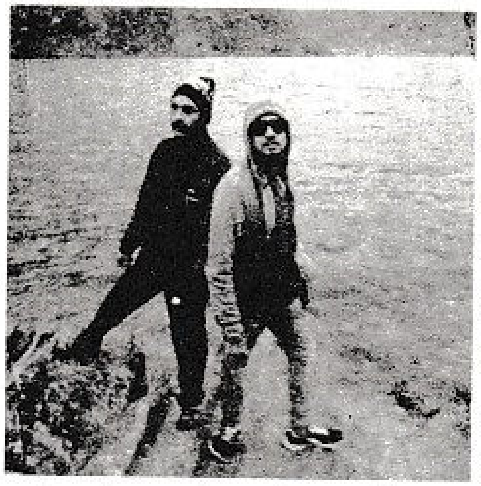

دورے کشمیر میں اور گزشتہ ماہ کراچی کے ٹور میں بھی کام آتی رہی۔ شیو کے بعد گرم پانی دستیاب تھا، نہایا اور ان دونوں کو اٹھایا۔ 10 بجے پہاڑی کے اوپر بلال بھائی کے ہاں ناشتہ پر جانا ہے۔ مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے جاتے جاتے گیارہ بجا دیے۔

کیسا میں ہم سفر تمہارا ہوں
ساتھ ہوں، منتظر تمہارا ہوں

ناشتہ پر ان کے دو مہمانوں سے ملاقات ہوئی۔ سعید سب انسپکٹر اور اس کے بیٹے سے جو لاہور پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے یہاں سے ناشتہ کر کے ہم کوئی ایک بجے کے قریب پتریاٹہ چلے گئے وہاں چیئر لفٹ اور کار لفٹ دونوں میں سیر کی، بڑا مزہ آیا اور تصاویر بنائیں۔ آخری پوائنٹ پر جا کر چائے پی اور ساتھ نمکو کھائی۔

اے ڈبلیو نے مرنڈا بوتل منگوائی تھی جو ہم چائے سے پہلے لائن میں لگے انتظار میں پی چکے تھے۔ جانے کیوں زبان خشک اور آنکھیں تر ہو رہی تھیں۔ اچانک اداسی کی طویل چادر نے چاروں طرف سے لپیٹ لیا تھا۔ اس موقع پر شعر یاد آیا

اداسی یونہی بے سبب نہیں ہوتی
درد آواز چھین لیتا ہے

واپسی پر ٹیکسی لی اور دو سو روپے دیکر اپنے ہوٹل کے پاس اترے۔ اس دوران بلال بھائی کا فون آیا۔ کہ آپ ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ میں نے کہا دس منٹ تک پہنچ رہے ہیں۔ ہم پھر سیدھے ہوٹل آئے دس منٹ میں فریش ہو گئے اور رات کے کھانے کے لیے پہنچ گئے۔ ان کی رہائش سطح سڑک سے ساڑھے چھ

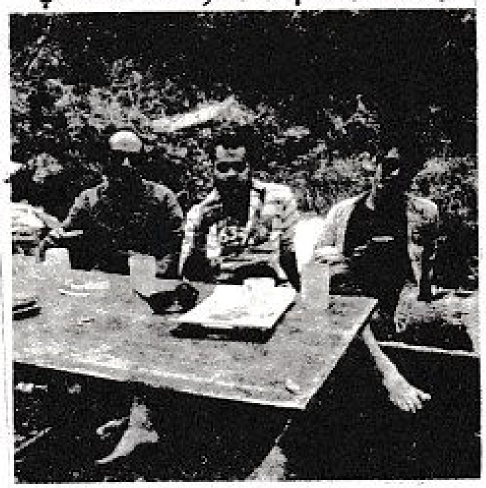

فٹ پر ہے۔ سانس پھول گیا۔ خیر۔ کھانا کھایا اور گپ شپ چلتی رہی۔ کھانے میں چکن، شلجم، اور چاول تھے۔ بعد میں چائے پی۔ کھانے کا مزہ آیا۔ بھوک لگی تھی اور کھانا بھی لذت دار تھا۔ وہاں سے ساڑھے 9 بجے ہم ہوٹل واپس آئے اب ہوٹل میں بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ کل انشاء اللہ مال روڈ اور پنڈی پوائنٹ جانا ہے، میرا ارادہ نتھیا گلی اور ایوبیہ جانے کا تھا مگر اے ڈبلیو نے کہا وہاں کچھ خاص بات نہیں۔ شاید اس کا ارادہ یا موڈ نہیں تھا۔ اس کے بعد واپسی کا پروگرام ہو گا۔ آگے اللہ تعالیٰ جو بہتر کرے گا۔ سوتے سوتے رات کے بارہ بج گئے۔ 10 ستمبر 2017 بروز اتوار: آج صبح میری آنکھ ساڑھے آٹھ بجے کھل گئی تھی۔ مگر پھر سو گیا پھر دوبارہ ٹائم دیکھا تو 08:40 ہو گئے تھے۔ اور ہم نے 10 بجے ناشتہ پر پہنچنا ہوتا ہے ہر روز لیٹ ہو جاتے ہیں۔ میں نے جلدی جلدی شیو بنائی، تیار ہوا ان دونوں دوستوں کو جگایا کہ ہم لیٹ ہو گئے ہیں، انہوں تیار ہوتے ہوتے کل کی طرح پھر گیارہ بجا دیئے۔ ہمارے میزبان کے دوسرے مہمان ناشتے پر ہمارا انتظار کر کے ناشتہ کر چکے تھے۔ خیر ہم نے بھی ناشتہ کیا تو دوپہر کے بارہ بج گئے۔ میزبان سے مال روڈ جانے کا راستہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہی سے پہاڑی کے راستے آپ جلدی جا سکتے ہیں۔ ہمیں راستہ بتایا اور آگے ایک شخص کو اشارہ کیا کہ انہیں گائیڈ کریں۔ اس نے ہمیں راستہ بتایا ہم چلتے چلتے مال روڈ کی پکی سڑک پر پہنچ گئے ہمیں کوئی آدھا پونا گھنٹہ لگ گیا۔ مال روڈ کی سیر کی، رونق دیکھی، تصاویر بنائیں اور کے ایف سی میں چلے گئے۔ وہاں سے برگر کھائے کوک پی باہر نکلے تو بارش ہو رہی تھی۔ وہیں رک گئے بارش ہلکی ہوئی، باہر نکلے سامنے چائے والا تھا۔ وہاں سے چائے پی بڑی بدمزہ چائے تھی، پسند نہ آئی اس نے چاکلیٹ بھی ملائی پھر بھی ذائقہ اچھا نہ لگا۔ وہاں سے پیدل چلتے چلتے اڈے تک پہنچے۔ وہاں پک اپ میں ہوٹل پہنچے ان دونوں دوستوں کا مری میں دل لگ گیا کہنے لگے ایک دن کا قیام اور بڑھا دیتے ہیں میں نے بلال بھائی کو کہا تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہوٹل بھی اپنا ہے اور گھر بھی اپنا ہے۔ اس وقت ہوٹل سے منگوا کر چائے پی۔ عبدالوہاب کا ارادہ ہے روالپنڈی جا کر نئی مووی پنجابی فلم دیکھی جائے۔ اور رات کو یہاں واپس آ جائیں۔ حالانکہ میرا دل نہیں مان رہا تھا تھکاوٹ کی وجہ سے مگر میں نے اس کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے تو مری میں بارش شروع ہو گئی اس بہانے راولپنڈی جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ طے پایا کہ ہوٹل ہی میں رہ کر اپنی اپنی پسند کی موویز اور سٹیج ڈرامے دیکھے جائیں تو کوئی بور نہ ہو پھر ایسا ہی ہوا۔ سب نے اپنی اپنی پسند کے پروگرام دیکھے۔ میں نے دو سٹیج ڈرامے بفیقا ان امریکہ اور شرطیہ مٹھے دیکھے۔ اس طرح وقت بھی گزر گیا۔ اس بات پر مجھے ایک شعر یاد آیا۔

میری دوستی کے دو ہی گواہ تھے
ایک وقت جو گزر گیا، ایک وہ جو مکر گیا

اس دوران شام کی چائے منگوائی اور پی، رات کو ہوٹل میں ہی کھانے کا پروگرام بنایا۔ کڑاہی گوشت بنوائی۔ کھانا کھایا سونے سے پہلے چائے پی اور پھر اپنی اپنی گہری نیند میں سو گئے۔ یہ نیند بھی کیا شے ہے۔ آ جائے تو گہری نہ آئے تو بے چین، بے تابی میں رات کٹ جاتی ہے اور ہر رات اپنے پیچھے ایک کہانی چھوڑ جاتی ہے۔ جو یادوں کے کرداروں پر چلتی رہے۔

11 ستمبر 2017، بروز پیر آج کمال کی بات یہ تھی کہ ہم سے پہلے ہمارا دوست جو ہمیشہ لیٹ سونے اور لیٹ جاگنے کا عادی ہے، صبح ہی صبح اٹھا اس کے بھی کچھ محرکات ہو نگے۔ آج ہم نے ہوٹل میں ہی ناشتے کا آرڈر دیا۔ کیونکہ بلال بھائی فیملی کیساتھ آج صبح آزاد کشمیر اپنے بھتیجے کی شادی میں شرکت کے لیے چلے گئے تھے۔ پراٹھے، فرائی انڈے اور چائے کا ناشتہ کیا۔ ہوٹل کے مین دروازے پر یادگاری تصاویر بنوائیں۔ ہوٹل سے پک اپ میں مری اڈے آ گئے تو لاہور والی گاڑی نکل رہی تھی ہم صرف پانچ منٹ لیٹ ہو گئے۔ مری سے کوچ کے ذریعے پنڈی آ گئے۔ یہاں سے عبدالوہاب نے راستے میں کھانے کے لیے بریانی مرنڈا بوتل لی اور لاہور جانے والی سکائی ویز کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اڈے سے ہم سوا پانچ بجے نکلے تھے۔ پونے سات بجے پنڈی پہنچے تھے وہاں سے لاہور کے لیے گاڑی سات بجے چلی یہ دونوں سفر میں سوتے رہے اور میں جاگ رہا تھا اور سوچ رہا تھا

نفرت کے طمانچوں نے دیا ہے مجھ کو یہ سبق
عظیم بھرم ہے انسان کا انسان سے پیار کرنا

خیر۔۔۔ گاڑی فراٹے بھرتی روانہ ہوئی۔ آج ہمارا سفر مکمل ہو گیا تھا اور شام کو ہم سفر کی خوب صورت یادوں کو سمیٹے ہوئے واپس روانہ ہوئے۔ گاڑی نے ایک جگہ بریک لگائی۔ وہاں ہم نے چائے پی اور رات کو گیارہ بجے لاہور پہنچے۔ گھر آ کر ہم نے کھانا کھایا چائے پی دونوں دوستوں نے رات ایک بجے کے قریب اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ سفر بہت اچھا رہا کیونکہ ہم سفر بہت اچھے تھے۔

سبز گلاب

عامر بن علی

ایک جاپانی کسان کی نوجوان بیٹی نے ایک رات عجیب خواب دیکھا۔ عجیب اس لیے کہ پھولوں سے بھرے اس سپنے کا مرکزی نقطہ سبز رنگ کا گلاب تھا۔ گلاب کی دنیا بھر میں سینکڑوں اقسام پائی جاتی ہے اور بیسوں رنگ اس کلاسیکی پھولوں کو زیبائی بخشتے ہیں، مگر سبز رنگ کا گلاب تو آج تک اس عالم رنگ و بو میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوشیزہ کے خواب کا دلچسپ حصہ یہ تھا کہ سبز رنگ کا یہ ایک پھول بازار میں ایک ہزار روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔ لڑکی نیند سے جاگی تو اس نے اپنا یہ خواب من وعن اپنے کسان باپ کو سنا دیا جو کئی دہائیوں سے پھولوں کی کاشت سے منسلک تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کسان نے اپنی بیٹی کا یہ خواب، اپنے چار کاشتکار دوستوں سے مل کر سچ کر دکھایا، سالہا سال کی سخت مشقت، محنت اور تجربات سے گزرنے کے بعد کسانوں کی یہ پانچ رکنی ٹیم سبز رنگ کا گلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اس ماہ سبز گلاب کو نا صرف نمائش کے لیے پیش کیا گیا بلکہ تجارتی پیمانے پر اس کی فروخت بھی شروع کر دی گئی ہے۔ تقریباً ہر رنگ کے گلاب کے ساتھ دنیا بھر میں اساطیر وابستہ ہیں۔ جتنی کہانیاں، مفروضے، توہم اور اظہاریئے اس پھول سے منسلک ہیں شاید ہی کسی اور گل سے جڑے ہوں۔ زرد رنگ کا گلاب بیزاری جدائی کی خواہش کا اظہار بھی ہو سکتا ہے۔ سرخ گلاب ہر دیس میں محبت اور خوشی کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔ گلابی اور سفید گلاب نیک خواہشات، پاک جذبات اور روحانیت کے لیے، ہمارے کلاسیکی ادب محبوب کے لبوں کی تازگی کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سبز رنگ کا گلاب شاید امارت، خوشحالی اور ترقی کی علامت کہلائے گا۔

یورپ کا رواج بھی خوب ہے کہ گلاب کے پھول ہمیشہ طاق تعداد میں تحفتاً پیش کیے جاتے ہیں، ایک، تین، پانچ، سات، جفت تعداد میں گلابوں کا تحفہ منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ مرنے والوں کے جنازے اور آخری رسومات میں شرکت کرتے ہوئے ہمیشہ جفت تعداد میں گلاب کے پھول ہدیہ کیے جاتے ہیں۔ پھول تو چاہے دنیا کے کسی بھی ملک کے ہوں، خوبصورت ہی لگتے ہیں مگر یہاں کے پھولوں میں ایک خرابی ہے۔ ان میں خوشبو نہیں ہوتی، آپ سبزیاں اور درختوں کے پتے سونگھ لیں یا گلاب اور دیگر پھول، آپ کو انیس اور بیس کا فرق بھی معلوم نہیں ہوگا۔ پاکستان جیسے خوشبودار پھول مجھے کہیں بھی نہیں ملے۔ اس سے بڑا ظلم بھلا کیا ہوگا کہ یہاں مندروں، معبدوں اور قبروں پر چڑھائے جانے والے پھولوں پر خوشبودار پرفیوم چھڑکا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بھگوان کے ساتھ کھلا دھوکا اور مردوں کے ساتھ فراڈ ہے۔ باردیگر عرض کرتا ہوں کہ پھول پھر پھول ہیں، خوبصورت تو لگتے ہی ہیں۔ عام لوگوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر جیسے ظالم شخص کو بھی پھول پسند تھے اور وہ بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ روسی کمیونسٹ انقلاب کا معمار لینن سخت گیر مشہور ہے، مگر اس کے کوٹ پر ہمیشہ ایک پھول سجا ہوتا تھا، بعدازاں یہ جنگلی پھول یورپی سوشلسٹ کارکنوں کے یونیفارم کا ضروری حصہ بن گیا، یہ پھول لینن کے ساتھ اس طرح نتھی ہوا کہ اب بھی میں نے دیکھا ہے کہ کمیونزم کے مخالف روسی نژاد لوگ اس پھول کو دیکھ کر اکثر چڑ جاتے ہیں اور سوشلسٹ خیال رکھنے والے لوگ اب بھی اسے سینوں پر ٹانکتے ہیں۔

جارج برنارڈ شا کی اس بابت اپنی منطق تھی۔ پھولوں سے اسے بے حد پیار تھا، مگر توڑنا وہ گوارا نہیں کرتا تھا۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا اس کے لان میں پھول ہی پھول اگے ہوئے تھے۔ ایک دن اس کا ایک دوست اس کے گھر ملنے آیا برنارڈ شا اسے لینے کے لیے خود دروازے پر آیا اور اپنا سارا مکان اندر سے دکھایا۔ دونوں جب سٹڈی روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو عزیز دوست برنارڈ شا سے کہنے لگا کہ ایک چیز دیکھ کر میں بہت حیران ہوا ہوں، تمہارا باغیچہ تو پھولوں سے لدا پڑا ہے لیکن تمہارے گھر کے کسی گلدان میں ایک بھی پھول نہیں سجا ہے۔ برنارڈ شا نے جواب دیا کہ مجھے تو بچے بھی بہت پیارے لگتے ہیں لیکن میں ان کا گلا کاٹ کر میز پر نہیں سجا سکتا، تزئین و آرائش کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں۔ یہ وضاحت کرتا چلوں کہ برنارڈ شا سے مراد یہاں برطانوی دانشور، مصنف اور فلسفی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ ہمارے دوست عدنان شیرازی کے بقول، سیالکوٹ ڈگری کالج میں انگریزی کے ایک فاضل

پروفیسر نے ایک ہونہار طالب علم سے پوچھا کہ برنارڈ شا کون ہے؟ طالب علم کا جواب تھا "سرجی وہ ضرور علی پور سیداں کے سادات میں سے ہی کوئی ہوگا"۔ جو کہ ہمارے شاہ جی کا آبائی علاقہ بھی ہے۔

خواب کی بات ہو رہی تھی، متذکرہ جواں سالہ کسان زادی نے اپنے خواب میں جو سبز رنگ کا گلاب دیکھا اس کا ایک نام بھی تھا "کونکوسارے" جو ایک ہزار روپے کے عوض بازار میں ایک عدد پھول فروخت ہو رہا تھا۔ تازہ ترین احوال یہ ہے کہ لڑکی کے والد نے دیگر چار کسانوں کے ساتھ مل کر جنہوں نے سبز رنگ کے گلاب کو خواب سے حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ وزارت زراعت میں اس پھول کو "کونکوسارے" کے نام سے رجسٹرڈ کرنے کی درخواست دائر کر دی ہے۔ گویا اس کا خواب حرف بہ حرف حقیقت بننے جا رہا ہے۔ سبز لباس پہن کر پیدا ہونے والی گلاب کی یہ قسم "سپرے گلاب" کہلاتی ہے۔ جس میں نوک شاخ پر ہمارے دیسی گلاب کی طرح واحد پھول کی بجائے پھولوں کا ایک گچھا لگتا ہے۔ سبز رنگ کے گلاب کا تصور پیش کرنے والی خاتون کے والد کا کہنا ہے کہ جب میں نے مذکورہ خواب سنا تو میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ اگر میں اسے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ پھول بہت زیادہ فروخت ہوگا کیونکہ میں نے بھی اپنی زندگی میں سبز گلاب نہیں دیکھا تھا۔ آج یہ سبز گلاب حقیقت بن کر ٹوکیو سمیت کئی شہروں میں پھولوں کی دکانوں پر دستیاب ہے۔ اور عام پھولوں سے دگنی قیمت پر فروخت بھی ہو رہا ہے۔ پھول کی کامیابی ہی غالباً اس کی گراں قیمت کی وجہ ہے۔ چونکہ ابھی تک ضلع آئیچی کے فقط مذکورہ پانچ کاشتکار ہی تجارتی بنیادوں پر اسے کاشت کر رہے ہیں۔ میرا شکوہ نما اعتراض تو اس پھول پر بس یہ ہی ہے کہ یہ بھی یہاں کے دیگر پھولوں کی طرح خوشبو سے عاری ہے۔

زاہد محمود زاہد/ ملتان

شدت ہجر بڑھا سکتا ہوں
وہ نہ آئے تو میں جا سکتا ہوں

شام سے جان چھڑانے کے لیے
رات سے ہاتھ ملا سکتا ہوں

اس یقیں سے کبھی آواز تو دے
میں ترے سامنے آ سکتا ہوں

اب تو اس نے بھی اجازت دی ہے
نام لے کر بھی بلا سکتا ہوں

وہ مصور ہوں کہ آنکھوں میں تری
اپنی تصویر بنا سکتا ہوں

اب اکیلا ہوں تو آسانی سے
خود کو میں دوست بنا سکتا ہوں

کب تھا سوچا کہ تعاقب میں ترے
میں کہ خود کو بھی گنوا سکتا ہوں

زاہد محمود زاہد/ ملتان

اور تو کر بھی تو کیا سکتا ہے
تجھے جانا ہے تو جا سکتا ہے

جال پانی میں لگا رہنے دو
رات کو چاند بھی آ سکتا ہے

نام لکھا ہوا ہاتھوں پہ ترا
میری سانسیں بھی بڑھا سکتا ہے

ان کی جھکتی ہوئی پلکوں سے کھلا
پیار دل میں بھی سما سکتا ہے

میں تو کیا میرا کمرہ بھی تمہیں
دل کی ہر بات بتا سکتا ہے

اپنے معصوم تعارف کے لیے
وہ تو جگنو بھی اُڑا سکتا ہے

میں مصور ہوں مگر یار مرا
مجھے تصویر بنا سکتا ہے

کاش کہہ دے اُسے جا کر کوئی
آنا چاہے تو وہ آ سکتا ہے

پھر بھی زاہد میں کبھی سوچتا ہوں
وہ مجھے کیسے رُلا سکتا ہے

شاعری

لگتا ہے دیکھ کر ترے نقش و نگار کو
قدرت نے کر دیا ہے مجسم بہار کو
جن کے لیے عدم تیری دوری کا نام ہے
کہتے ہیں زندگی ترے قرب و جوار کو
اس آئینے میں رنگ نہ تھے تجھ سے پیشتر
تو نے حسیں بنا دیا لیل و نہار کو
اس میں کسی کی جان گئی ہے تو کیا تمہیں؟
تم نے تو آزما لیا خنجر کی دھار کو
صرف اس لیے کہ میرے نشانے کی زد میں تھا
حاسد شکاریوں نے اُڑایا شکار کو
گلزار وقفِ گردشِ پیہم ضرور ہے
لیکن زمان چھوڑتی ہے کب مدار کو

گلزار بخاری/لاہور

دور تک میں نے جب طے کیا راستہ
پھر کہیں جا کے مجھ پر کھلا راستہ
عشق میں رہتی ہے منزلوں پر نظر
اس میں کوئی نہیں دیکھتا راستہ
دکھ ہوا تو نے جب راستے میں کہا
اب جدا ہے ترا اور مرا راستہ
میں بھٹک بھی گیا تو بنا جاؤں گا
اک نئی رہگذر، اک نیا راستہ
کاش بے کیف و بے رنگ یہ زندگی
تیری قربت سے ہو جائے آراستہ
میں مخالف ہوں تقلید کا اس لیے
مت دکھائے مجھے رہنما راستہ
شکر ہے ہم سفر مہرباں تھے سعیدؔ
ورنہ دشوار تھا جابجا راستہ

ڈاکٹر سعید عاصم/لاہور

میانِ دل جو یہاں راستہ بنا ہوا ہے
ترے لیے ہی تو سارا نیا بنا ہوا ہے
وہ جس کے نور سے روشن ہیں انفس و آفاق
وہی چراغ، مجھے آئنہ بنا ہوا ہے
لگا کے رنگ مجھے نیلمیں بناتا ہوا
وہ بوئے گل سے سوا، ما سوا بنا ہوا ہے
نہ جانے، کون سی آتش نے چھو لیا دل کو
چمک دمک کا، نیا سلسلہ بنا ہوا ہے
سنہری باغ کا رستہ دکھاتا ہے مجھ کو
بدن پہ پھول جو اُس کے ہرا بنا ہوا ہے
جہاں کسی کو بھی خاطر میں کوئی لاتا نہیں
ہمارا ہونا وہاں، واقعہ بنا ہوا ہے
خدا ہی پوچھے گا اُس سے، برائے خلق خدا
جو ایک شخص زمیں پر خدا بنا ہوا ہے
غلام و شاہ کا اک کھیل کھیلنے کے لیے
وہ بادشاہوں میں سب سے بڑا بنا ہوا ہے
بنا ہے اشک کسی آنکھ میں، یہ دل کامیؔ
جگر کا خوں کہیں رنگِ حنا بنا ہوا ہے

سید کامی شاہ/کراچی

کسی بھی کام سے دل کو خوشی نہیں ہوتی
یہ زندگی ہے، تو یوں زندگی نہیں ہوتی
یہ دیکھ، دیکھنا کس کو ہے اور کیسے ہے
یہ جان! دل کی لگی، دل لگی نہیں ہوتی
ہر ایک کھلتا ہوا پھول گل نہیں ہوتا
ہر ایک اُڑتی ہوئی شے پری نہیں ہوتی
نہ جانے کیسے ہمیں آسماں نظر آتا
جو قید خانے کی کھڑکی کھلی نہیں ہوتی
میں اپنے حال میں جتنا بھی مست رہتا ہوں
تمہاری یاد میں کوئی کمی نہیں ہوتی
تمہارے بعد مرے باغ زرد ہو گئے ہیں
سو آ کے شام یہاں، کاسنی نہیں ہوتی
دلوں کے بھید کبھی جان ہی نہیں پاتے
وہ لوگ جن نے محبت کری نہیں ہوتی
جلانا پڑتا ہے دل بھی دماغ بھی کامیؔ
بجھے چراغ سے تو روشنی نہیں ہوتی

سید کامی شاہ/کراچی

یادیں

میرے اجداد کا وطن یہ چمن
میری تعلیم کا جہاں یہ مکاں
میرے بچپن کی دوست یہ گلیاں
جن میں رُسوا ہوا شباب کا نام
یاد آتے ہیں ان فضاؤں میں
کتنے نزدیک اور دور کے نام
کتنے خوابوں کے مہکتے چہرے
کتنی یادوں کے وہ مرمریں جام
کتنے ہنگامے کتنی تحریکیں
کتنے نعرے تھے جو تھے زبان زدِ عام
وہ عظیم لوگ، وہ عظیم لمحے وہ عظیم کے خوبصورت کام
سب بیت گئے سب روٹھ گئے
اب صرف میں اور میرے بے نام کام

محمد عظیم/لاہور

سوال: جشن مشاعروں میں بطور منتظم اعلیٰ آپ کی شرکت رہی۔ ان کا بھی تذکرہ ہو جائے۔

جواب: ان جشنیہ مشاعروں کے بانی سلیم جعفری تھے جن کا خیال تھا کہ شاعر کو اُس کی زندگی میں سراہنا چاہیے اس لیے انہوں نے جشنیہ مشاعروں کا آغاز کیا۔ سلیم جعفری دبئی میں یہ مشاعرے منعقد کرتے تھے اور ابوظہبی اور العین میں منصور جاوید، نجم جعفری، مستان شریف، ڈاکٹر رشید رانا اور اعجاز یوسف شامل تھے۔ ان جشنیہ مشاعروں میں میری بحیثیت شاعر و منتظم اعلیٰ شرکت رہی۔ ان مشاعروں میں جشن خمار ۱۹۸۷ء، جشن فراز ۱۹۸۸ء، جشن سحر ابوظہبی ۱۹۸۹ء، جشن جون ایلیا ۱۹۹۰ء، جشن مجروح ۱۹۹۱، جشن غزل و غزال ۱۹۹۱، جشن قتیل شفائی ۱۹۹۲، جشن جگن ناتھ آزاد ۱۹۹۳ء، جشن محشر ۱۹۹۴ء، جشن کیفی ۱۹۹۵ء، جشن پیرزادہ قاسم ۱۹۹۶ء، جشن علی سردار جعفری ۱۹۹۷ء شامل ہیں۔

سوال: بین الاقوامی مشاعروں میں اپنی شرکت کے بارے میں بتائیے۔

جواب: جی الحمدللہ! اُس کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ مختصراً قطر، سعودیہ، لندن، امریکہ، کراچی، لاہور، بحرین، دبئی، شارجہ، راس الخیمہ اور العین کے کئی معروف و عالمی تنظیموں میں بحیثیت صدر محفل، مہمان خصوصی کے شرکت میرے لیے اعزاز رہا ہے۔

سوال: اب تک کتنے اعزازات حاصل کر چکے ہیں؟

جواب: اللہ کے فضل سے نمایاں اعزازات میں، دبئی میں نوائے وقت کی جانب سے مجید نظامی ایوارڈ، انجمن فروغ اردو ادب دوحہ، قطر کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں اعزازی شیلڈ، اُردو مرکز جدہ کی جانب سے اعزازی شیلڈ، اُردو اکیڈمی لندن کی جانب سے اعزازی شیلڈ، انجمن فروغ اردو ادب دوحہ، قطر کی جانب سے ۲۰۱۴ء میں اعزازی شیلڈ، سوشل سنٹر شارجہ کی جانب سے اعزازی شیلڈ، پاکستان ایسوسی ایشن دبئی کی جانب سے جشن پاکستان ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔

سوال: ادب اور زندگی میں کیا فرق ہے؟

جواب: ادب اور زندگی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

سوال: بڑے شاعر کی کیا خصوصیات ہیں؟

جواب: پہلے زمانے میں بڑا شاعر اپنی شاعری، علمیت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منواتا تھا، مگر آج اپنے آپ کو اچھا اور بڑا شاعر منوانے کے لیے پبلک ریلیشن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جبکہ آج

Receiving award from Sharjah Social Center

کے دور میں بھی بڑے قابل، عالم اور بہترین شاعر موجود ہیں جو اردو ادب کے لیے ایک سرمایہ ہیں، مگر وہ پس منظر میں ہیں کہ ان کی کوئی انجمن تحسین باہمی نہیں ہے۔

سوال: ادب برائے ادب اور ادب برائے اصلاح میں آپ کس کے قائل ہیں؟

جواب: ادب برائے زندگی ہو تو ادب برائے ادب اور ادب برائے اصلاح دونوں کا حصول ناممکن نہیں۔

وہ جو لوگ دل کی کتاب تھے وہ کہاں گئے
جو محبتوں کا نصاب تھے وہ کہاں گئے

وہ جو حُسن تھا وہی حُسن حُسن نہیں رہا
وہ جو عشق کے سبھی باب تھے وہ کہاں گئے

وہ جو ہم نے سوچا تھا ویسا یہاں کچھ بھی نہیں یہاں
جو ہماری آنکھوں کے خواب تھے وہ کہاں گئے

وہ جو دوست اچھے تھے خوب اچھے تھے کیا ہوا
جو ذرا ذرا سے خراب تھے وہ کہاں گئے

بھلا کیا ہوئے سبھی جگنوؤں کے وہ قافلے
وہ جو تتلیاں جو گلاب تھے وہ کہاں گئے

میرے ذہن میں یہ سوال کیسے سوال ہیں
جو میرے لبوں پہ جواب تھے وہ کہاں گئے

یہاں افتخار نہیں رہا کوئی افتخار
وہ جو عزت مآب تھے وہ کہاں گئے

افتخار شوکت/لاہور

منکیرہ میں مقیم معروف شاعر مقبول ذکی مقبول کا
سرائیکی شعری مجموعہ
سجدہ
مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے
ناشر: اُردو سخن آرٹ لینڈ گرلز کالج روڈ، لیہ

ادبی خبریں/تقریبات

عامر رانا کے مجموعہ "کیفیت" کی تقریب پذیرائی

لاہور (تاثیر نقوی) شعروادب کی دنیا کا روشن ستارہ اور دوستوں میں محبت تقسیم کرنے اور وجہ دوستی بننے والی شخصیت مادرا بکس (پبلشر) کے سی ای او اور نامور شاعر خالد شریف کی طرف سے عامر رانا کے شعری مجموعہ ''کیفیت'' کی تقریب پذیرائی ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت معروف شاعر لطیف ساحل نے کی اور مہمانانِ خصوصی واعزاز میں معروف شاعر ڈاکٹر اختر شمار، عباس تابش، سعید الظفر صدیقی، محمد جاوید انور جی ایم ریلوے، شارق جمال آئی جی پولیس ریلوے اور صاحب کتاب عامر رانا شامل تھے۔ تقریب کی پہلی نشست میں شازیہ مفتی، فاخرہ انجم، ڈاکٹر اختر شمار اور لطیف ساحل نے عامر رانا کی شاعری اور کتاب کے حوالے سے بات کی۔ نظامت کے فرائض خالد شریف نے خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ تقریب کے دوسرے سیشن میں محفل مشاعرہ کا اہتمام تھا جس میں فیصل زمان چشتی، خالد شریف، غلام عباس فراست، پروفیسر شاہینہ کشور، محمد شہزاد، سفینہ سلیم ایڈووکیٹ، پروفیسر ڈاکٹر جواز جعفری، شازیہ مفتی، روحی طاہر، شبنم مرزا، نائلہ انجم، رشید جدون، فاخرہ انجم، عامر رانا، تاثیر نقوی، سیماب ولید، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، صائمہ آفتاب، جبار واصف، توقیر احمد شریفی، ممتاز راشد لاہوری، سلیم اختر ملک، ڈاکٹر غافر شہزاد، عامر بن علی، ڈاکٹر صغریٰ صدف، سعید الظفر صدیقی، ڈاکٹر اختر شمار، محمد جاوید انور، شارق جمال، نوشی گیلانی، عباس تابش اور صدر مشاعرہ لطیف ساحل نے اپنا اپنا خوبصورت کلام سنا کر حاضرین سے خوب داد سمیٹی۔ مشاعرہ کے اختتام پر ہائی ٹی کا شاندار اہتمام کیا گیا تھا اس طرح ایک تادیر یاد رہنے والی خوبصورت تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

عرفان الحق صائم انتقال کر گئے

بلوچستان کے معروف شاعر، صحافی اور ادبی شخصیت عرفان الحق صائم گزشتہ روز حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ مرحوم سرکاری ملازمت چھوڑ کر عرصہ دراز سے صحافت سے وابستہ تھے۔ انہوں نے علم وادب کے میدان میں انمٹ نقوش چھوڑے۔

مقابلہ ہیر گائیکی

روزنامہ خبریں اور پلاک کے زیر اہتمام پلاک میں گزشتہ دنوں کل پنجاب مقابلہ ہیر گائیکی منعقد ہوا۔ مہمانِ خصوصی ضیا شاہد تھے۔ منتظم ڈاکٹر صغرا صدف تھیں اس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھرپور شرکت کی۔

حکیم ارشد شہزاد کے ساتھ شام

گزشتہ دنوں معروف شاعر حکیم ارشد شہزاد کے ساتھ پلاک میں ایک شام کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈائریکٹر جنرل پلاک ڈاکٹر صغرا صدف نے کی۔ مہمانِ خصوصی چودھری انور عزیز (سابق وفاقی وزیر) مدثر اقبال بٹ (سینئر صحافی) تھے۔ اس تقریب میں حکیم ارشد شہزاد سے متعلق پروفیسر محمد عباس مرزا، امجد علی بھٹی، خالد منیر بٹ، طاہر وزیر آبادی، چودھری حسن اختر ایڈووکیٹ ڈاکٹر جمیل احمد پال، ڈاکٹر کرامت مغل، ہارون عدیم، اصغر بھٹی اور احمد نعیم ارشد نے گفتگو کی۔ اہتمام پلاک نے کیا تھا۔

عرفان اللہ عرفان/ظفروال

صحرا جیسے دامن کو پھیلائے ریت ندی بن جائے
اللہ تعالیٰ یوں بادل برسائے ریت ندی بن جائے
ہم نے اب کیا پانی بھرنا ہم کیا ایسے پیاسے ہیں
اپنا کیا ہے اپنی بلا سے جائے ریت ندی بن جائے
رومی شامی ہو کہ حجازی حبشی یا تبریزی ہو
آپ کی نظر رحمت میں جو آئے ریت ندی بن جائے
میرا دل ہے گھر کے آئے ساون کے گھنگور گھٹا
آپ بتائیں آپ کی کیا ہے رائے ریت ندی بن جائے
چلتے چلتے عمر گزاری وقت کی دھوپ اور چھاؤں میں
ڈھلتے ڈھلتے دور گئے ہیں سائے ریت ندی بن جائے
چاہ جانا قسمت سے ہے یارو حسن دلیل نہیں
دلہن وہ جو اپنے پیا من بھائے ریت ندی بن جائے
وادی لہکے خوشبو مہکے مست ہوا میں پی پی چہکے
پربت کی آغوش میں جھرنا گائے ریت ندی بن جائے

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: مہکتے خواب/مصنف: سیّد قاسم جلال/صفحات: 84 /تبصرہ نگار: تسنیم کوثر
ناشر: تسکین ذوق، لاہور

خوشی اس بات کی ہے کہ زمانے کی تیز رفتاری، وقت کی کمی اور الیکٹرانک میڈیا کے ہنگاموں کے باوجود کتابی ادب کی افادیت اور حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کتاب کا چسکا رکھنے والے لوگ اب بھی اچھی تحریروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تخلیقی ادب سے وابستہ لوگ بھی اپنی ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد قاسم جلال بھی اسی ڈگر کے مسافر ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے کا نام ''مہکتے خواب، دہکتی تعبیریں'' ہے۔ یہ عنوان ان کے مجموعے میں شامل ایک افسانے کا بھی ہے۔

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال نے ایک طویل مدت کے بعد اپنے افسانوں کو کتابی صورت میں لانے کا فیصلہ کیا ہے جو یقیناً ایک خوش آئند فیصلہ ہے۔ میں اُن سے یہ ضرور کہوں گی کہ وہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد افسانہ نگاری کے سفر کو جاری رکھیں۔ آپ کا قاری آپ سے مزید افسانوں کا متقاضی ہے۔ میری طرف سے آپ کو اس افسانوی مجموعے کی اشاعت کی دلی مبارک ہو۔

نام کتاب: تیرا میرا سانجھا پیا/مصنف: ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/صفحات: 176 / قیمت: 400 روپے/تبصرہ نگار: قمر ریاض
ناشر: عبداللہ ہسپتال، قادر آباد، روڈ علی پور چٹھہ گوجرانوالہ

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کی کتاب ''تیرا میرا سانجھا پیا'' کی تحریریں یوں محسوس ہوتی ہیں کہ جیسے یہ ایک بندے کا عشق مجازی سے عشق حقیقی کی جانب سفر ہے۔ تصوف ایک ایسی عطا ہے جو نصیب ہو جائے تو انسان کا ظاہر و باطن ایک ہونے لگتے ہیں۔ پوشیدہ بھی نظر آنے لگتا ہے، ایک پاکیزہ روشنی اور خوشبو انسان کے اندر سے پھوٹنے لگتی ہے اسے ہر لحہ معطر اور خوشبو دار کیے رکھتی ہے۔ انسانوں سے محبت دل کو سکون دیتی ہے مگر خالق دو جہاں سے محبت روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ مالک حقیقی کا ڈر اس سے محبت اور تقویٰ ایسے قرینے ہیں جو انسان کو رب کائنات سے جوڑ کر رکھتے ہیں۔ دنیاوی لالچ، طمع اور ہوس اس انسان کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔ لاحاصل کا عشق ہی اصل عشق ہے اور لاحاصل صرف اس رب ذوالجلال کی ہستی ہے جس کی ذات میں ہر طرح کے اسرار پوشیدہ ہیں۔

یہ دنیا، یہ لوگ، یہ چرند، یہ پرند، یہ رات، یہ دن سب نشانیاں ہیں اس ''ایک'' کے ہونے کی جو انسان کے وجود میں اپنے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ سلیمان عبداللہ ڈار بھی اس نردبان کے پہلے زینے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ جہاں سے آگے پیر جلنے لگتے ہیں۔ یہ مشکل راستہ ان کے دل نے چنا ہے اور ان کے دل کو کہاں سے اشارہ ہے یہ ان کی تحریریں خود بتائیں گی۔ کسی کو چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کی جولذت ہے اس سے شاید ڈاکٹر سلیمان عبداللہ اب آشنا ہونے لگے ہیں۔ ان کے لفظوں کی وارفتگی، چاشنی اور مٹھاس ان کے اندر کے صوفی کی علامت ہے جو انہیں ہر طرح سے آباد رکھے ہوئے ہیں۔ یہی لو انہیں ایک دن عشق حقیقی کی اگلی منزل تک ہاتھ پکڑ کر لے جائے گی۔

نام کتاب: بے چہرہ لوگ/مصنفہ: صائمہ نورین بخاری/صفحات: 138 / قیمت: 700 روپے/تبصرہ نگار: ملک مقبول احمد
ناشر: مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور

صائمہ نورین بخاری نے ادب کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ گیارہ برس کی عمر میں انہوں نے اردو کے مقبول ترین اخبار روزنامہ ''امروز'' میں پہلی کہانی

''جگنو'' بچوں کے صفحہ پر لکھی۔ ان کے کئی افسانے اظہر جاوید مرحوم کے رسالہ تخلیق میں شائع ہوئے، وہ نہ صرف عمدہ افسانہ نگار ہیں بلکہ وہ تنقید میں بھی ایک خاص قدر و قیمت رکھتی ہیں اور بہت خوب صورت لہجے کی شاعرہ بھی ہیں۔ ماہنامہ ''تخلیق'' میں ان کی ایک نظم چھپی تھی۔ جس کا موضوع عام نسوانی موضوعات سے الگ تھا۔ اسے بے حد پسند کیا گیا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''منظر، خواب، دریچے'' شاعری کا مجموعہ ''سفر آغاز کرتے ہیں'' اور ''اردو تنقید کے تخلیقی زاویے'' منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے خاندان کی شاعرہ، افسانہ نگار اور تنقید نگار صائمہ نورین بخاری اعلیٰ پائے کی مقررہ بھی ہیں۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے کئی تقریری مقابلوں میں ٹرافیاں حاصل کیں۔ مضمون نویسی کے مقابلوں میں انعامات اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ معاشیات اور انگریزی ادب، سیاسیات، فلسفہ اور تاریخی موضوعات پر بھی مقالے تحریر کیے۔ صائمہ نورین بخاری افسانہ نگاری کے میدان میں بھی منفرد مقام کی حامل ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے ان کے افسانوں کو زندگی اور بندگی سے لبریز افسانے اور سلمیٰ اعوان نے ان کو ''اردو افسانے کی مایہ ناز مصنفہ قرار دیا'' گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین خانیوال اور ملتان میں بطور آنریری لیکچرار تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ ادب ان کی زندگی کی اہم ترین سرگرمی ہے۔ لہٰذا اب زیادہ وقت وہ ادب کو دیتی ہیں۔ صائمہ نورین بخاری کے افسانوں کی نئی کتاب ''بے چہرہ لوگ'' کی اشاعت کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔

نام کتاب: رشحاتِ نسیم سحر/ مصنف: نسیم سحر/ صفحات: 208 / قیمت: 350 روپے/ تبصرہ نگار: قمر الطاف
ناشر: دُنیائے اُردو پبلی کیشنز، اسلام آباد

نسیم سحر صاحب نے اپنے مضامین میں کسی قسم کے فلسفے یا مشکل پسندی کو نزدیک نہیں آنے دیا بلکہ انہوں نے سادہ انداز میں اپنا مدعا بیان کر دیا ہے جو اس دور کا تقاضہ بھی ہے۔ مضامین میں ادب پارے کو تنقید و تحقیق دونوں حوالوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آنے والے وقت میں ان مضامین کی اہمیت و افادیت محقق اور نقاد صحیح طریقے سے کر سکیں گے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو موصوف نے اس صنف کے ساتھ انصاف برتا ہے جو کہ ان کی ہر تحریر میں موجود ہے۔ جس کی وجہ میرے خیال میں اُن کی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں۔ نسیم سحر کا شعری سفر نصف صدی سے تجاوز کر چکا ہے۔ ملکی و بین الاقوامی سطح پر یہ اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اس لیے کسی شعر پر رائے دینا ان سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ چند مضامین جو خصوصیت کے حامل ہیں وہ مضطر اکبر آبادی، سعود عثمانی، یونس اعجاز، گلزار بخاری، غازی علم الدین اور افضل آرش کی ادبی خدمات کے حوالے سے ہیں۔ جناب نسیم سحر نے ان مضامین میں اپنے تنقیدی شعور کا صحیح استعمال کیا ہے۔ تاہم ہر مضمون اور دیباچہ اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ ان کا یہ شاہکار ادب کے طلباء خصوصاً ریسرچ سکالرز کی خوب رہنمائی کرتا رہے گا۔

نام کتاب: الف (اللہ) میم (محمد)/ مصنف: ڈاکٹر محسن لدھیانہ/ صفحات: 392 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: باقی احمد پوری
ناشر: جہانگیر بکس، لاہور

الف میم کا میں نے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اس میں شوق کی وارفتگی اور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے گہری عقیدت و محبت سے بھرپور جذبات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دیتا ہے۔ ہزاروں لوگ، شاعر اور ادیب بھی حج پر جاتے ہیں۔ مدینہ میں حاضری بھی دیتے ہیں مگر سفرنامہ لکھنے کی توفیق ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ خدا نے ڈاکٹر محسن مگھیانہ کو سفرِ حج اور زیارت روضہ رسول اکرمؐ کے فیوض و برکات سے بھی نوازا ہے اور انہیں یہ خوبصورت پر اثر سفرنامہ لکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ یہ یقیناً ان سینکڑوں غریب مریضوں کی دعاؤں کا نتیجہ بھی ہے جن کا خلوصِ دل سے وہ علاج کر چکے ہیں۔

نامہ ہائے احباب

محترم ومکرم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ حال ہی میں میری نئی کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔

اس کتاب کے دو نسخے آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔ براہِ کرم اس کتاب پر اپنے رسالے میں تبصرہ کرا دیں۔ اس سے پہلے بھی کچھ کتب اور کلام ارسال کیا تھا۔

آپ کا دلی طور پر ممنون وشکرگزار رہوں گا۔

کبھی میرے لیے بھی وقت نکالیں۔ ماضی میں تو لاہور سے مجھ پر خاص نمبر شائع ہوئے ہیں۔

شیت رُٹھے یار کوں میڈا خیال آوے ولا

میں وفا دی راہ وچ ایں آس تے حالی کھڑاں

ڈاکٹر سیّد قاسم جلالؔ

حسن عباسی پیارے جگ جگ جیو مہاراج

تسلیمات! ارژنگ میاں چنوں کی رونقیں لے کر آیا۔ چنے چنے میاں صاحبان (دو بھائیوں) نے ایک تاریخی مشاعرہ منعقد کر ڈالا۔ جناب عامر بن علی کو شاید یہ خبر نہیں کہ ہزارے کی طرف بھی شاعر بستے ہیں۔ جو ارژنگ کے باقاعدہ لکھنے والے بھی ہیں اور پاکستان کے مقتدر ادبی جرائد کے ''چہیتے'' بھی ہیں۔ ہرچہ بادا باد مشاعرہ زبردست تھا۔ ارژنگ نے اچھے اچھوں نے اس کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے۔ دوٹوک بات کی ہے ڈنڈی کسی نے نہیں ماری۔ جہاں ارژنگ کی اتنی حُسن آرائیاں ہیں وہاں ایک اور سہی۔ مانا بھائیوں کا جگرا ہے جو شاعری کے اس طوفان سے صحیح سلامت پار اُترے ہیں۔ ارژنگ زندہ باد

خیراندیش

آصف ثاقب

پیارے بھائی عامر بن علی/حسن عباسی

آپ پر سلامتی ہو۔

اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔

ارژنگ ملتا رہتا ہے۔ ادھر پچھلے 4 سال میں 3 مکان بدل چکا ہوں ہر بار ڈاکیا بے چارہ پریشان ہوتا ہے اور بالآخر ڈھونڈ ہی لیتا ہے ہمارے گھر کا پتہ۔

بہت پہلے اشاعت کی غرض سے کچھ چیزیں بھیجی تھیں پتہ نہیں شائع ہوئیں یا یا ڈاک کی نذر ہوگئیں۔

یہ کچھ غزلیں نظمیں ہیں۔ دیکھ لیجیے اُمید ہے پسند آئیں گی۔ کوشش کروں گا حاضری ہوتی رہے۔ لاہور تو آنا نہیں ہو سکا۔ ''قدیم'' بھی اشاعت کے مراحل میں ہی ہے۔ ابھی کتاب آ جائے تو لاہور آنا ہے۔ سب دوستوں سے ملاقات رہے گی۔

کلام شامل اشاعت کریں تو مطلع کر دیجیے گا۔

مالک آپ کو شادکام رکھے۔ والسلام

خیراندیش

سیّد کامی شاہ، کراچی

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون ماہنامہ ارژنگ ستمبر 2017 کا شمارہ مل گیا ہے۔

جس میں حمد و نعت، منقبت و سلام اور شعری گوشے مضامین افسانے ادبی خبریں تبصرۂ کتب اور بھی بہت کچھ کس کس صفحہ کی میں تعریف کروں۔ سب کچھ معیاری اور دل میں اُتر جانے والا ہے۔ آپ کو ایک سلام حضرت امام حسینؓ ارسال کر رہا ہوں اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ ساتھ میں اپنی کتاب سجدہ اسلامی سرائیکی شعری مجموعہ بھیج رہا ہوں۔ اس پر تبصرہ کریں ہم آپ کے شکرگزار رہیں گے۔

مقبول ذکی مقبول

منکیرہ، بھکر

محترم عامر بن علی صاحب

السلام علیکم۔ جناب حسن عباسی صاحب کی محبتوں میں لپٹا ماہنامہ ارژنگ جب بھی موصول ہوتا ہے سرتا پا سرشاری کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے کہ یہ کارجنوں قحط الرجال کے اس دور میں بھی جاری ہے۔ ارژنگ ٹائٹل سے لے کر ٹائٹل بیک تک محنت، محبت لگن، خلوص اور تخلیقی عمل سے عشق کا کا مونہہ بولتا ثبوت ہے۔

تمام مندرجات باکمال، حمد، نعت، غزلیں، نظمیں، افسانے مضامین، بہترین ادب پارے اعلیٰ ترین حسن ترتیب کے ساتھ۔ ادب کی مسلسل آبیاری پر آپ کو اور حسن عباسی صاحب کو ڈھیروں مبارک باد۔

نیازت علی نیاز

سنٹرل پارک میڈیکل کالج، لاہور

پاکستان میں سب سے زیادہ شاعری کی کتب شائع کرنے والا ادارہ

نستعلیق
Publications

ہم کتاب کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں
کیونکہ ہمیں کتاب سے محبت ہے

مسودہ کی تیاری، کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ
ٹائٹل ڈیزائننگ، پیسٹنگ، طباعت، جلد بندی
تمام مراحل مکمل ذمہ داری اور پیشہ ورانہ تجربے کے ساتھ

خوبصورت کتاب کی اشاعت ایک آرٹ ہے

اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے آج ہی رابطہ کیجیے

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

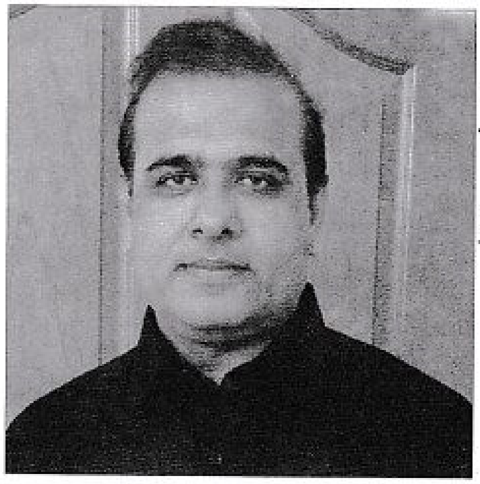

یورپ میں چند روز

ناروے، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، ڈنمارک، فرانس اور اسپین کے یادگار عالمی مشاعرے

یورپ کی سیر، دوستوں سے ملاقاتیں اور ادبی محفلوں میں شرکت

ماں نے میرا ماتھا چوما
پھر میں ملکوں ملکوں گھوما

حسن عباسی

دنیا کے مختلف ممالک میں ادبی تنظیمیں وقتاً فوقتاً یادگار علمی و ادبی پروگرام کا انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ جن میں ادبی کانفرنسیں اور مشاعرے شامل ہیں۔ یہ ادبی تنظیمیں سمندر پار پاکستانیوں نے بنائی ہوئی ہیں جو گزشتہ کئی دہائیوں سے وہاں آباد ہیں

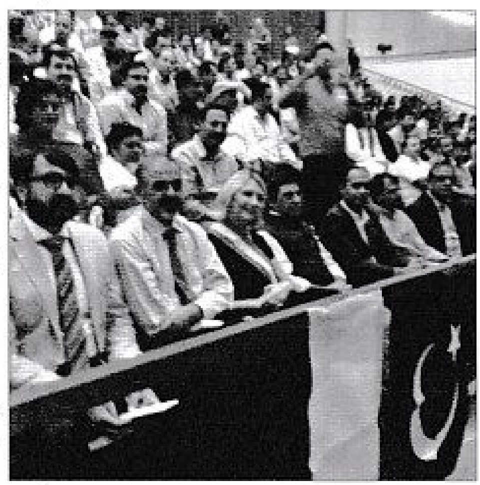

اور وہ خود شاعر، ادیب ہیں۔ بیرون ملک وہ شاعر جنہوں نے ابتدا میں ادب کے چراغ جلائے تھے ان میں کئی ملک عدم کو سدھار گئے۔ ان کی جگہ نئے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے ہیں جو شعر و ادب کے متوالے ہیں۔ سو یہ دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے۔ البتہ عام طور پر کچھ ہمارے سینئرز شاعر جو یہ تاثر دیتے ہیں کہ بیرون ممالک میں اپنی نئی نسل علم و ادب سے بالکل بے بہرہ ہے اور تقریبات کا سلسلہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ یہ بات مکمل درست نہیں ہے اس کے بارے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ خود یہ سینئرز شعرا ہر ماہ کسی نہ کسی باہر کے ملک میں مشاعرے میں گئے ہوتے ہیں۔ بلکہ امریکہ جائیں تو مہینوں واپس نہیں آتے۔ اگست میں مجھے نیم فی غوری کی طرف سے اٹلی میں کانفرنس کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ کانفرنس فیدنسا اٹلی میں تھی جس میں مختلف ممالک سے شعرا شرکت کر رہے تھے۔ یورپ کے مختلف ممالک سے مجھے مشاعروں اور تقریبات کے لیے سارا سال دعوت نامے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب بھی یورپ جانے کا پروگرام بنتا ہے بیشتر ملکوں میں وہاں کی ادبی تنظیمیں میرے اعزاز میں مشاعرے منعقد کرتی ہیں۔ تقریبات سجاتی ہیں حتی المقدور کوشش کے باوجود ہر بار کئی ممالک کے دوست ناراض ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ویزہ محدود ہونے کے باعث میں وہاں شریک نہیں ہو پاتا۔ اس بار تو

ایک ماہ کا ویزہ تھا۔ مشاعرے بھی بہت سے ملکوں میں تھے۔ لہٰذا وہی صورت حال بدستور رہی۔ پھر چند ملکوں میں دوستوں کی خواہش کے باوجود نہ جا سکا۔ 9/11 کے بعد دنیا کے حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ دہشت گردی کے باعث پاکستانیوں کے لیے یورپ کے ویزے کا حصول کار سہل نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ناروے میں مقیم دو انتہائی عزیز دوستوں محمد ادریس لاہوری اور ڈاکٹر سید

ندیم حسین کے محبت بھرے اصرار پر سب سے پہلے ناروے میں پڑاؤ کیا۔ محمد ادریس لاہوری اور ڈاکٹر ندیم کی دوستی فی زمانہ اپنی مثال آپ ہے۔ یک جان دو قالب ہیں۔ میں اس حوالے سے خود

کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ دونوں مجھ سے کمال محبت کرتے ہیں۔ میں اوسلو پہنچا تو ہمیشہ کی طرح ان کی محبت کی چھتری میں وہاں کی برساتیں گزریں۔ خوب سیر وتفریح ہنسی مذاق، گپ شپ اور ہلا گلا رہا۔ میرے اعزاز میں دریچہ کے پلیٹ فارم سے انھوں نے فورست لائبریری ہال فیورست میں ایک بہت ہی خوب صورت محفل

مشاعرہ کا انعقاد بھی کیا جس کی صدارت اوسلو کے سینئر اور پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ یافتہ شاعر جمشید مسرور نے کی۔ نظامت کے فرائض دریچہ کے جنرل سیکرٹری ادریس لاہوری نے ادا کیے۔ دریچہ کے صدر ڈاکٹر ندیم بھی میرے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ اس مشاعرے میں بھی یورپ کے مختلف ممالک سے شعرا شریک تھے۔ مقامی شعرا میں ارشد شاہین، آفتاب وڑائچ، ہیناجی، فیصل ہاشمی، خالد تھتھال، رابعہ سیماب رومی، رائے بھٹی، اندر جیت پال، سکھ دیو سنگھ، جان دتہ، راجہ اسلم میر اور نرمل بھرم چاری شریک تھے۔

ہمدمِ دیرینہ ارشد شاہین سے بھی یہاں ملاقات خوب رہی۔ دنیا چار دن کی ہے اور اوسلو میں میرا قیام دو دن کا تھا۔ اٹلی سے جیم فے غوری کے فون بار بار آرہے تھے۔ انھوں نے میرا ایئر ٹکٹ اوسلو سے میلان بھیج دیا تھا اور بتا رہے تھے کہ میلان ایئرپورٹ سے ہم آپ کو لے لیں گے اور پھر فیدنسا چلیں گے جہاں کانفرنس کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ پروگرام کے مطابق میں میلان پہنچا۔ میری آمد سے ایک دن قبل میلان کا درجہ حرارت 44 تھا جو کہ اٹلی کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے جس دن میں پہنچا صبح بارش ہوگئی تھی اور موسم قدرے خوش گوار ہو گیا تھا۔ میلان سے فیدنسا تقریباً 2 گھنٹے کا سفر نہایت خوش گوار گزرا۔ فیدنسا بہت خوب صورت چھوٹا سا ویلج ہے سرسبز وشاداب تفریحی مقام پر چار روزہ ادبی کانفرنس کا انعقاد جس میں کئی ممالک کے شعرا کی شرکت جیم فے غوری کے ذوق کی داد تو بنتی تھی سو ہم نے ملتے ہوئے انہیں اس حوالے سے خوب سراہا۔ کانفرنس کا موضوع تھا ''اردو زبان وادب کی صورت حال پاکستان اور یورپ میں'' اس کانفرنس کے مختلف سیشن تھے جن میں مشاعرے، میوزیکل پروگرام،

کلاسیکل رقص، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی سیر اور مشاعرہ راقم کے ساتھ ایک شام بھی رکھی گئی۔ خواتین شاعرات کے ساتھ بھی ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اُردو زبان وادب کے حوالے سے بھی خوب سیشن رہے۔ میوزک میں ناروے سے جان دتہ دیوانہ اور رقص میں فن لینڈ سے آئی ہوئی انڈین لڑکی شمع جاہ نے خوب محفل جمائی۔ شعرا

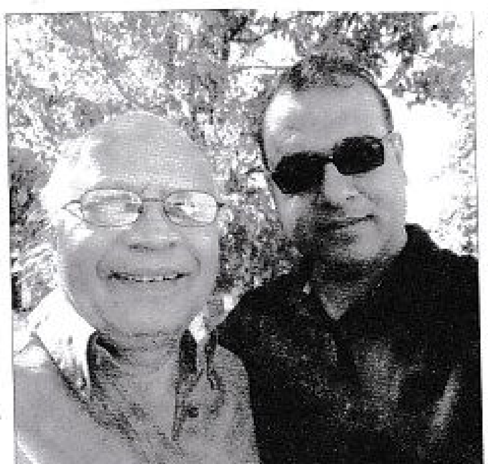

میں صدف مرزا ڈنمارک سے غزل انصاری اور فرزانہ فرحت برطانیہ سے صدیق گل اسپین سے

رضا شاہ، بہنام احمد، ہیثم علی آغا، علی اصغر چودھری و دیگر ادیب اٹلی سے شریک ہوئے۔ افیدنسا سے

تمام شعرا کی رفاقت میں سوئٹزرلینڈ کا سفر میری زندگی کا یادگار سفر تھا۔ سوئٹزرلینڈ کی سیر میرے بچپن کا خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر ہوا۔ سوئٹزرلینڈ میں مشاعرہ راقم کی صدارت میں ہوا اور تمام شعرا اور مندوبین کو اسناد بھی راقم کے ہاتھوں دی گئیں۔ بسلسلہ یومِ آزادی اگلے دن میلان میں پرچم

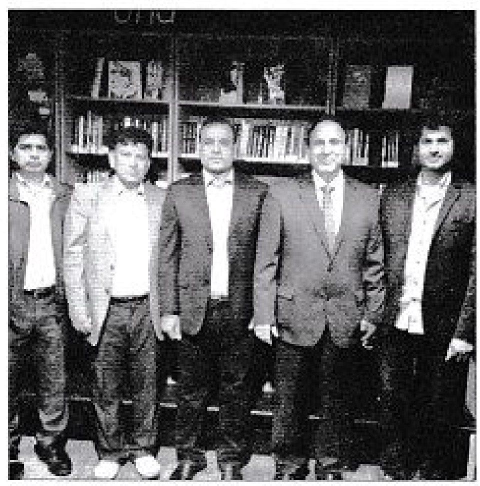

کشائی کی تقریب اور مشاعرہ بھی یادگار رہا۔ ہال میں پاکستان کمیونٹی کے دو ہزار کے قریب لوگ موجود تھے اور 500 کے قریب اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے باہر کھڑے تھے اس تقریب میں لارڈ نذیر (برطانیہ) میئر میلان، ایمبیسڈر پاکستان اور راقم مہمانان میں شامل تھا۔ مشاعرے میں تمام شعرا کو بھرپور داد ملی اس کے لیے رضا شاہ اور ملک نصیر کی محبتوں کا شکر گزار ہوں۔ میلان میں میرے ایک اور دوست طارق شاہ ہیں جن کی رفاقت اور محبت ناقابل فراموش ہے۔ میں جب بھی اٹلی جاتا ہوں وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے مجھے اٹلی کی سیر کرانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بار بھی ان کی گاڑی میں رضا شاہ کے ساتھ تاریخی شہر برگمو اور ویرونا کی سیر یادگار رہی۔ میری اگلی منزل ڈنمارک کا شہر کوپن ہیگن تھا جہاں میرے دوستوں نے بیلی کے پلیٹ فارم سے ظفر اقبال اعوان کے شعری مجموعے ''زیویں سدھراں دی'' کی تقریب پذیرائی اور مشاعرہ رکھا ہوا تھا ''بیلی'' والوں نے مجھے میلان سے کوپن ہیگن کا ٹکٹ بھیج دیا تھا جب میں کوپن ہیگن پہنچا تو ظفر اقبال اعوان اور طاہر عدیل ہاتھوں میں پھول لیے اور چہروں پہ خوشی کے جذبات لیے میرے منتظر تھے۔ یہاں بھی میرا قیام صرف دو دن تھا اور یہ بہت پیارے دوست مجھے دو دن میں پورا کوپن ہیگن دکھانا چاہتے تھے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اس سے قبل کئی بار یہاں آ چکا ہوں تو انھوں نے سمندر کے کنارے اولڈ سٹی کی سیر کرائی جو کہ واقعی نہایت خوبصورت جگہ تھی۔ کوپن ہیگن کی تقریب میں سویڈن سے سائیں رحمت علی اسپین سے ارشد اعوان، ناروے سے جمشید مسرور بھی آ گئے۔ تقریب کی صدارت بزرگ شاعر اقبال اختر نے کی۔ مقامی شعرا میں فواد کرامت، کامران اقبال اعظم، صفدر علی آغا، صدف مرزا نے بھی کلام سنایا۔ ظفر اعوان کی تقریب اور مشاعرہ بہت یادگار رہا۔ پاکستانی کمیونٹی کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور راقم کو بہت زیادہ عزت و توقیر سے نوازا۔ تقریب کے

بعد پرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔ پیرس سے ایاز محمود ایاز رابطے میں تھے۔ انہوں نے تیسرے عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ پیرس کے مشاعرے میں برطانیہ سے نعیم حیدر، غزل انصاری اور گلاسکو سے فرحت زاہد امریکہ سے ریحانہ قمر

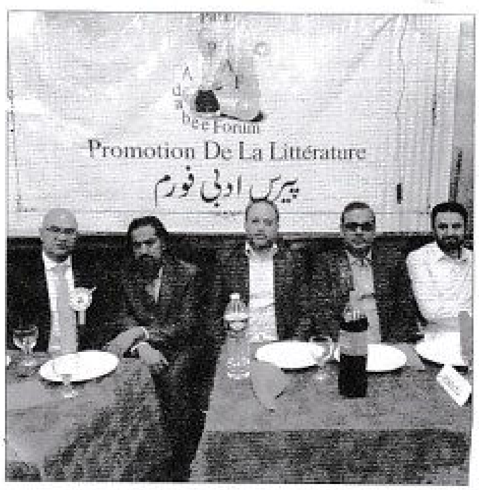

نے شرکت کی۔ راقم مہمانِ خصوصی تھا۔ پیرس ادبی فورم کے زیر اہتمام یہ تیسرا عالمی مشاعرہ بہت یادگار رہا۔ مقامی شعرا میں اسد رضوی، ایاز محمود

ایاز، ثمن شاہ، آصف جاوید آسی اور شاہد نے اپنا کلام سنایا۔ محفل موسیقی کا بھی خوب اہتمام تھا۔ اس بار پیرس چار دن رہنے کا موقع ملا اور خوب سیر کی۔ میں اس کے لیے اسد رضوی، ایاز محمود ایاز اور آصف جاوید کی محبتوں کا شکر گزار ہوں۔ اس دوران مجھے جرمنی اور یورپ کے دیگر ملکوں سے بھی دعوت نامے مل رہے تھے۔ مگر میرے لیے ان میں شرکت کرنا ممکن نہیں تھا۔ سو پروگرام کے مطابق میں اسپین کے دارالحکومت بارسلونا پہنچ

جہاں میرے بہت عزیز دوست ارشد نذیر ساحل ایئرپورٹ پر دوستوں کے ہمراہ موجود تھے۔ بارسلونا کی فضا سانحہ بارسلونا کی وجہ سے سوگوار تھی۔ بارسلونا میں بہت سے دوستوں سے ملاقات رہی۔ میں یہاں پہلے تین بار آ چکا ہوں۔ جن میں یہاں کی ادبی تقریبات کی جان ہیں۔ اس کے علاوہ فیاض ملک، حافظ احمد، قیس رضوی، میاں دانش اور دیگر احباب شامل ہیں یہاں میرے [illegible] میں مختلف چھوٹی چھوٹی ادبی تقاریب

ہوئیں۔ البتہ سیر خوب کی ارشد نذیر ساحل کی موجودگی بارسلونا میں شاعروں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں وہ سراپا محبت ہے۔ یورپ میں اکیس روز گزرنے کی وجہ سے لاہور بہت یاد آ رہا تھا۔ سو دو دن دوبئی میں قیام کے بعد لاہور واپس آ گیا۔ بقول ناصر کاظمی:

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

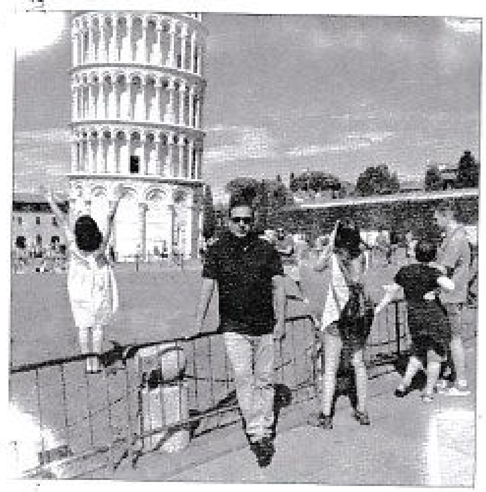

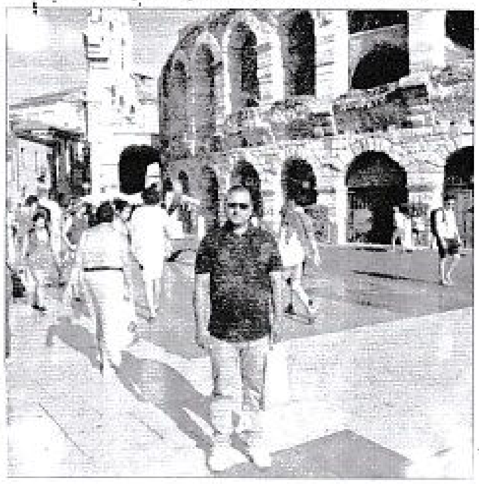

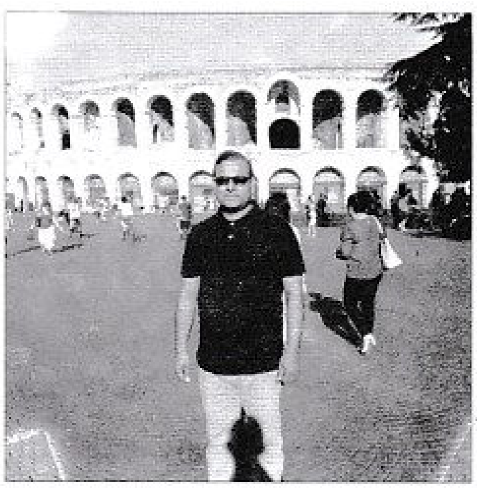

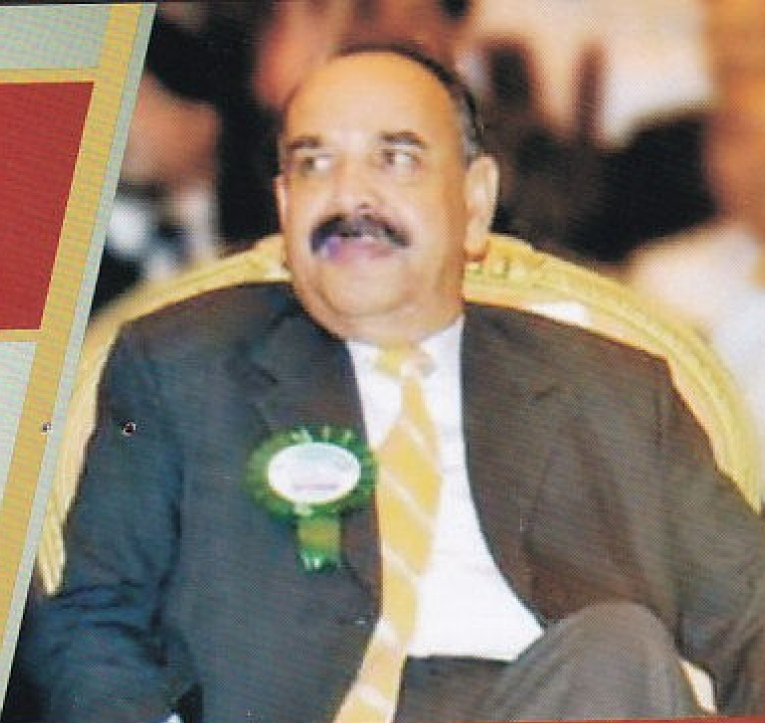

آج اپنے آپ کو اچھا اور بڑا شاعر منوانے کے لیے پبلک ریلیشن کا سہارا لینا پڑتا ہے

ابوظہبی میں مقیم نامور شاعر اور کالم نویس

ظہور الاسلام جاوید

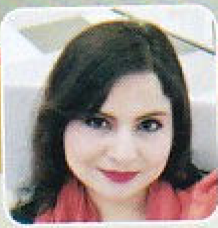

انٹرویو: لبنیٰ صفدر

• ادب کی طرف رُجحان کیسے ہوا؟

• بچپن ہی سے ملنے والے ادبی ماحول کا خاص اثر رہا، پہلی غزل ۱۹۶۶ء میں مشہور ادبی رسالے عکس لطیف میں شائع ہوئی۔ ریڈیو پاکستان کراچی کی بزم طلباء میں کئی بار شرکت کی۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں ریڈیو پاکستان کراچی کے ہفتہ طلباء کے بین الکلیاتی مشاعرہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔ جامعہ کراچی سندھ مسلم سائنس کالج کراچی اور دیگر اداروں سے انعامات وصول کیے۔ پھر مجھے ٹیکنو جسٹ رسالے کا ایڈیٹر انچیف بھی مقرر کر دیا گیا۔

• فروغ ادب کے کے لیے کیسے وقت نکال پاتے ہیں؟

• اللہ تعالیٰ نے ایسے روزگار کے مواقع عطا فرمائے کہ ان ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت نکالنا مشکل نہیں رہا۔ اگر ایسا کہوں تو زیادہ بہتر رہے گا جس کام میں بھی نیت صاف ہو اور حوصلے بلند ہوں تو اللہ تعالیٰ بھی وقت میں برکت ڈال دیتے ہیں۔

• اپنی فیملی کے بارے کچھ بتایئے۔

• میرے پانچ بچے ہیں۔ ڈاکٹر احمد انعام، اسماء ندیم، ڈاکٹر یاسر انعام اور ربیعہ ذیشان جو خوشگوار ازدواجی رشتوں میں بندھ چکے ہیں۔ جبکہ ایک بیٹا منصور انعام ہمارے ساتھ ہے جو اللہ کی رضا سے ہمارا سہارا ہے اور ہم اس کے سہارے ہیں۔ گویا مجھے کبھی کوئی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا (عاجزی سے) الحمدللہ

• اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

• مجموعہ کلام ''موسم کا اعتبار نہیں'' شائع ہوا۔ جبکہ اپنے والد محترم انعام گوالیاری کے نعتیہ مجموعہ کلام ''سب اچھا کہیں جسے'' اور مجموعہ کلام ''نغمہ زیرلب'' کے علاوہ ظہور گوالیاری کے مجموعہ کلام ''فروزاں ہیں چراغ آرزو'' کی ترتیب وتدوین بھی کر چکا ہوں۔

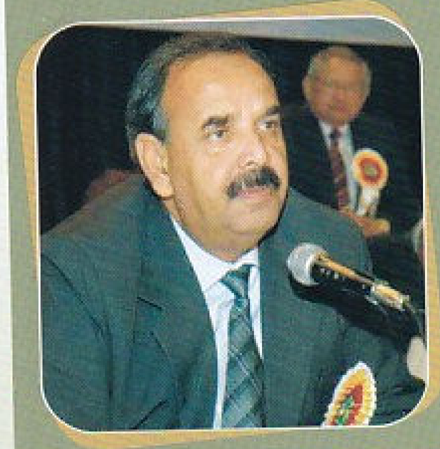

ادب برائے زندگی ہو تو ادب برائے ادب اور ادب برائے اصلاح دونوں کا حصول ناممکن نہیں

• آپ صحافت سے بھی منسلک رہے یہ سفر کیسا رہا؟

• جی! الحمدللہ شعبہ صحافت کے حوالے سے جنگ اور مشرق سے منسلک رہا اور اب یونیورسل اردو پوسٹ کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک ہوں۔ روزنامہ اردو ایکسپریس، روزنامہ الشرق میں کالم نگاری بھی کرتا رہا۔ جو بعدازاں میری بڑھتی ہوئی ادبی مصروفیات کی نذر ہو گئی۔ ہاں ایک اور بات...... کہ میری ادارت میں امارات کا پہلا اُردو رسالہ ۱۹۸۰ء ''لالہ صحرا'' شائع ہوا تھا جو بہت مقبول ہوا۔

• منعقد ہونے والے عالمی مشاعروں سے قارئین کو کچھ بتایئے

• اب تک دس عالمی مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔ جن میں عالمی اردو مشاعرہ مئی ۲۰۰۲ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی ۲۰۰۳ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی ۲۰۰۴ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی ۲۰۰۹ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ مئی ۲۰۱۰ء ابوظہبی، عالمی اردو مشاعرہ ۲۰۱۵ء ابوظہبی شامل ہیں اور اس کے علاوہ بام شعر وادب الامارات کے تحت مشاعرہ ۱۹۸۶ء ابوظہبی، مشاعرہ ۱۹۸۶ء العین اور مشاعرہ ۱۹۸۶ء دبئی کے انتظامی امور میں شامل تھا اور یہ اللہ کا خاص کرم ہے ہر مشاعرہ ہی کامیاب اور یادگار رہا ہے۔

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

لاہور پریس کلب لٹریری سوسائٹی کی طرف سے

ڈاکٹر فاطمہ حسن کے نام ایک شام

صدارت : ڈاکٹر اجمل نیازی • مہمانِ خصوصی : عامر بن علی • نظامت : ڈاکٹر صغرا صدف

مقررین

سامعین

یادگاری شیلڈ پیش کرتے ہوئے

سامعین

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com